آسان اُردو

گیارھویں جماعت کے لیے

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو

قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب کی تصحیح شدہ
جملہ حقوق بہ حق سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو محفوظ ہیں
تیار کردہ: سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو سندھ
منظور شدہ: وزارتِ تعلیم اسلام آباد بہ طور واحد درسی کتاب
برائے اعلیٰ ثانوی مدارس، صوبہ سندھ

نگرانِ اعلیٰ: عبدالعلیم لاشاری
چیئرمین، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ جام شورو

نگراں: ناہید اختر

مدیر: محمد ناظم علی خاں ماتلوی

مؤلف: مولوی سلیم عبداللہ

پروف خوانی: محمد انیس خان

کمپیوٹر گرافکس: بختیار احمد بھٹو

فہرست

نمبر شمار	مضمون		مصنف	صفحہ
۱-	حمد	(نظم)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۵
۲-	نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی ہجرت		علامہ سیّد سلیمان ندوی	۸
۳-	نام ور ادیبوں کے خطوط		غالب، اکبر، شبلی، نذیر احمد، سر سیّد	۱۲
۴-	حُبِ وطن	(نظم)	مولانا حالی	۱۶
۵-	جیسی کرنی ویسی بھرنی		خواجہ حسن نظامی	۱۹
۶-	ایران کا جاڑا		مولوی محمد حسین آزاد	۲۳
۷-	آدمی نامہ	(نظم)	نظیر اکبر آبادی	۲۶
۸-	نصوح کا خواب		مولوی نذیر احمد	۲۹
۹-	اسلامی حکومت کا امیر سب کا خادم ہوتا ہے		مؤلّف	۳۳
۱۰-	آسمان اور تارے	(نظم)	مولوی محمد اسمٰعیل میر ٹھی	۳۶
۱۱-	سب سے بڑا اسلامی شاعر		مؤلّف	۳۸
۱۲-	حجِ اکبر		منشی پریم چند	۴۰
۱۳-	رُباعیات	(نظم)	انیس، حالی، اکبر، داغ	۴۷
۱۴-	ایک وصیّت کی تعمیل		مرزا فرحت اللہ بیگ	۵۱

نمبر شمار	مضمون	مصنف	صفحہ
۱۵-	پاکستان کے لیے پہلا جہاد	مؤلّف	۵۶
۱۶-	طالبِ علموں کے نام سر سیّد کا ایک خط	سر سیّد احمد خان	۶۰
۱۷-	مردِ مجاہد (نظم)	مولوی شفیع الدین نیّر	۶۳
۱۸-	اُردو کی آخری کتاب	پطرس بخاری	۶۶
۱۹-	مولانا محمد علی جوہر	مولانا عبدالماجد دریابادی	۶۹
۲۰-	آمدِ بہار (نظم)	احمد علی شوق قدوائی	۷۳
۲۱-	اُردو کی کہانی	مولوی عبدالحق	۷۶
۲۲-	حضرت صدیق اکبرؓ کا ایثار (نظم)	علامہ اقبال	۷۹
۲۳-	اسلامی کردار	مؤلّف	۸۱
۲۴-	میر معصوم شاہ بکھری	عبدالواحد سندھی	۸۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد

اے دو جہاں کے والی!
اے گلشنوں کے مالی!
ہر چیز سے ہے ظاہر حکمت تری نرالی
تیرے ہی فیض سے سرسبز ڈالی ڈالی
یہ سلسلہ جہاں کا
دنیا کے گلستاں کا
پھولوں بھری زمیں کا تاروں کے آسماں کا
سارا ہے کام تیرا سارا ہے نام تیرا
یہ خاک، آگ، پانی
ہے تیری مہربانی
ہر دَم ہَوا کے لب پر ہے تیری ہی کہانی
ہے دَم قدم سے تیرے دریاؤں میں روانی
ہر بحر اور بر میں
ہر خشک اور تر میں
ہر بیج اور شجر میں ہر شاخ اور ثمر میں
ہے فیض عام تیرا پیارا ہے نام تیرا
تو نے ہمیں بنایا
اور سوچنا سکھایا

ہر شے پہ ہم نے دیکھا تیرے کرم کا سایا
جس راستے میں ڈھونڈا تیرا نشان پایا
انسان بھی ہیں تیرے
حیوان بھی ہیں تیرے
جان دار بھی ہیں تیرے بے جان بھی ہیں تیرے
ہر اک غلام تیرا پیارا ہے نام تیرا

ابوالاثر حفیظ جالندھری

اشارے

۱- "حمد" اللہ تعالیٰ کی تعریف کو کہتے ہیں۔ حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی تعریف کو نعت کہتے ہیں اور اہلِ بیتؓ کی تعریف کو منقبت۔ ان کے علاوہ کسی شخص کی تعریف کی جائے تو وہ مدح ہے۔

۲- یہ حمد حفیظ جالندھری کی لکھی ہوئی ہے۔ حفیظ پاکستان کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں زیادہ تر اسلامی جذبات ہوتے ہیں۔ نظموں کی بندش چست ہوتی ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ انھی نے لکھا ہے۔

۳- شعر میں جملے کی بناوٹ اکثر بول چال کے مطابق نہیں ہوتی۔ بول چال کے مطابق جو عبارت ہوتی ہے، اسے نثر کہتے ہیں۔ نثر کے ہر جملے کے آخر میں فعل آتا ہے۔ مثلاً:

"ہر شے پہ ہم نے دیکھا- تیرے کرم کا سایا"

اس کی نثر یہ ہوگی:

ہم نے ہر شے پر تیرے کرم کا سایا دیکھا

اس طرح نثر کر لینے سے شعر کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب لکھیے۔

۱- اس نظم میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کی کن کن نعمتوں اور صنعتوں کا ذکر کیا ہے؟

۲- نظم کے پہلے بند کو نثر میں لکھیے۔

(ب) ڈالی ڈالی سرسبز ہے۔

اس جملے میں "ڈالی" کو دو بار کہنے سے مطلب "سب ڈالیاں" یا ہر ڈالی ہے۔ اسی طرح پتا پتا، کونا کونا، جگہ جگہ، قطرہ قطرہ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

(ج) "گلستاں" دو لفظوں سے بنا ہے۔ گل اور ستاں۔ ستاں کے معنی جگہ کے ہوتے ہیں۔ اس لیے گلستاں کے معنی ہوئے گل کی جگہ (باغ)۔ اسی طرح آپ پاک، افغان، کتاب، چمن کے ساتھ "ستاں" لگا کر الفاظ بنائیے اور معنی لکھیے۔

(د) ان لفظوں کے معنی لغت میں دیکھیے اور جملوں میں استعمال کیجیے:

روانی - ثمر - والی - فیض - کرم۔

نبی کریم کی ہجرت

حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ
حضرت محمد اللہ تعالٰی کے آخری نبی اور رسول ہیں، آپ (ﷺ) پر اور آپ کے آل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر رحمت اور سلامتی ہو۔

(علامہ سیّد سلیمان ندوی جنوبی ایشیا کے عالمِ دین مؤرخ اور اُردو کے نام ور مصنف تھے۔ انھوں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی پاک سیرت پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ذیل کا مضمون ان کی کتاب "رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ" کا ایک حصّہ ہے۔ دیکھیے کس قدر سادہ اور آسان زبان میں واقعے کا اظہار کیا ہے۔)

یثرب میں مسلمانوں کو امن کی جگہ مل گئی تھی۔ اس لیے آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے مکے کے مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا دیس چھوڑ کر شہر یثرب کو چلے جائیں۔ مسلمانوں نے اب آہستہ آہستہ یثرب کو ہجرت کرنی شروع کی۔ آخر میں حضرت محمد رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے بھی مکہ چھوڑ کر ہجرت کرنی چاہی۔ قریش کے لوگوں کو بھی اس کی خبر مل چکی تھی۔ انھوں نے آپس میں مل کر یہ طے کیا کہ رات کو ہر قبیلے کا ایک آدمی جمع ہو اور سب مل کر ایک ساتھ حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کو سوتے ہوئے قتل کر دیں۔ خدا نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کو ان کے اس مشورے کی خبر کر دی۔

مکے والوں کو آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے مذہب سے گو مخالفت تھی، مگر پھر بھی سب کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی دیانت اور امانت پر بڑا بھروسا تھا۔ چناں چہ بہت سے لوگوں کی امانتیں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے پاس تھیں۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ امانتیں حضرت علی مرتضیٰؓ کے سپرد کیں اور فرمایا کہ آج تم میرے بستر پر آرام کرنا اور صبح لوگوں کو اُن کی یہ امانتیں دے کر تم بھی چلے آنا۔ اس حکم کے مطابق حضرت علیؓ نے رات کو آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے بستر پر آرام

کیا۔ قریش کے لوگ صبح تک گھر کو گھیرے پڑے رہے۔ صبح سویرے دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے بستر پر حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے بجائے علیؓ بن ابی طالب ہیں۔

آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ میں ہجرت کا مشورہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دونوں اپنے گھروں سے نکل کر مکے کے پاس ہی "ثور" نامی ایک پہاڑ کے غار میں چھپ گئے۔ صبح کو کافروں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی کھوج شروع کی اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس غار کے منھ تک آ گئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ گھبرا کر بولے، "یارسول اللہ (حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ)! دشمن اتنے قریب آ گئے ہیں کہ اگر وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم کو دیکھ لیں گے۔" لیکن حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے اطمینان کا وہی حال تھا۔ فرمایا، "گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ تین دن تک اِسی غار میں رہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے عبداللہؓ رات کو آ کر مکے والوں کے حالات اور مشوروں کی خبر دیا کرتے تھے۔ کچھ رات گئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا غلام چپکے سے یہاں بکریاں لے آتا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کا دودھ پی لیتے۔

چوتھے دن آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ غار سے نکلے۔ ایک رات اور ایک دن یوں ہی چلتے رہے۔ دوسرے دن دوپہر کو ایک چٹان کے نیچے سائے میں دم لیا۔ ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اس سے دودھ لے کر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے پاس آئے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے پی لیا اور پھر آگے بڑھے۔ قریش نے اشتہار دیا کہ جو محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ) کو یا ابو بکر صدیقؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ سراقہ بن جعشم نے جو مکے کا ایک خُوب صورت سپاہی تھا یہ اشتہار سنا تو انعام کے لالچ میں ہتھیار سجا کر گھوڑے پر سوار نکلا اور ٹھیک اس وقت اس چٹان کے پاس پہنچا جب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ اس نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کو دیکھ لیا اور چاہا کہ گھوڑا دوڑا کر نزدیک پہنچ جائے لیکن

گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ ترکش سے تیر نکال کر عرب کے دستور کے مطابق فال نکالی۔ جواب میں "نہیں" آیا۔ مگر وہ نہ مانا۔ دوبارہ گھوڑا دوڑایا۔ اب گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ تب وہ ڈرا اور سمجھا کہ یہ ماجرا کچھ اور ہے۔ حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ سے عرض کی "اے خدا کے رسول! امن بخشا جائے۔" حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے اس کی درخواست قبول فرمائی۔

مدینہ، عربی میں شہر کو کہتے ہیں۔ حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے یثرب تشریف لے آنے کے بعد یثرب کا نام مدینۃُ النبی (یعنی نبی کا شہر) مشہور ہوا۔ اس وقت سے اس کا نام مدینہ ہو گیا۔

مدینے کے لوگوں کو آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی آمد کی خبر ہو چکی تھی اور سب پر انتظار کا عالم تھا۔ بچّے تک خوشی اور جوش میں گلی کوچوں میں کہتے پھرتے تھے کہ "ہمارے پیغمبر حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ آ رہے ہیں۔" چھوٹی چھوٹی لڑکیاں چھتوں پر چڑھ کر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے آنے کی خوشی میں گیت گاتی تھیں۔ نوجوان ہتھیار سجا سجا کر شہر سے باہر نکل جاتے تھے اور پہروں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ ایک دن وہ انتظار کر کے واپس پھرے ہی تھے کہ ایک یہودی ایک مختصر سا قافلہ آتے دیکھ کر پکارا، اے لوگو! تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا۔ اس آواز کو سنتے ہی سارا شہر تکبیر کے نعروں سے گونج اُٹھا اور مسلمان، ہتھیار لگا کر باہر نکل آئے۔ یہ ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ اور نبوّت کا تیرہواں سال تھا۔

اشارے

۱- اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر بسنے کو ہجرت کہتے ہیں اور جو ایسا کرتا ہے وہ مہاجر کہلاتا ہے۔

۲- انصار- ناصر کی جمع ہے۔ اس کے معنی مددگار کے ہیں۔ مدینے کے جن مسلمانوں نے حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کا ساتھ دیا اور مدد کی وہ "انصار" کہلاتے ہیں۔

۳- قرآن شریف میں آں حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے غار میں چھپنے کا واقعہ بہت پُر اثر انداز میں چند لفظوں میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۴۰ دیکھیے اور اس کا ترجمہ پڑھیے۔

قواعد

اس مضمون میں یہ جملہ ہے: "اگر وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم کو دیکھ لیں گے"۔ اس جملہ میں دو فعل ہیں: دیکھیں اور دیکھ لیں گے، اس لیے ظاہر میں دو جملے ہوئے۔ مگر اصل میں جملہ ایک ہی ہے۔ پہلے جملے سے مطلب ادھورا رہتا ہے، دوسرا جملہ مطلب کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ بات "اگر" اور "تو" سے پیدا ہوتی ہے۔

"اگر" والے جملے کو شرط کہتے ہیں، "تو" والے جملے کو جزا۔ اگر کی بجائے جب آئے تب بھی تو والا جملہ آئے گا۔ جیسے "جب صبح ہوئی تو میں گھر سے نکلا۔"

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب لکھیے۔

۱- ہجرت سے پہلے مدینے کا کیا نام تھا؟

۲- ہجرت کے واقعے میں حضرت علیؓ نے کیا حصّہ لیا؟

۳- "غارِ ثور" کا واقعہ بیان کیجیے۔

۴- سراقہ کون تھا؟ اس کا واقعہ بیان کیجیے۔

۵- ان لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

مہاجر - اطمینان - اشتہار - ترکش - فال - انتظار کا عالم۔

نام وَر ادیبوں کے خطوط

اُردو میں سب سے پہلے مرزا غالب نے خطوط نویسی کا ایک نیا طرز ایجاد کیا۔ ان کے خطوط بہت دل چسپ ہوتے ہیں۔ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سامنے بیٹھے ہوئے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ یہ طرز بہت پسند کیا گیا۔ چناں چہ ان کے بعد سر سیّد، آزاد، شبلی، حالی، اکبر اور دوسرے ادیبوں نے یہی طرز اختیار کیا۔ اب اس نمونے کے خطوط پسند کیے جاتے ہیں۔

ذیل میں نمونے کے طور پر چند خطوط نقل کیے گئے ہیں۔

(۱) مرزا غالب کا خط میر مہدی کے نام

اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم۔

حضرت آداب!

کہو صاحب! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

حضور! میں کیا منع کرتا ہوں؟ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تن درست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا۔ صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟

نہیں میرن صاحب، اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں، وہ خفا ہوتا ہو گا۔ جواب لکھنا ضروری ہے۔

حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے کیا خفا ہوں گے؟

بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

سبحان اللہ! سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں، تو باز رکھتا ہے۔

اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا ہے تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا ہوں۔ اب جو میں وہاں نہیں، نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ! میں بوڑھا آدمی، تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا۔ لا حول ولا قوۃ۔

سنو میر مہدی ! میرا کچھ گناہ نہیں۔ اپنے خط کا جواب پڑھو۔ تپ تو دفع ہو گئی۔ پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔

میں خط لکھ چکا۔ سرنامہ لکھ چھوڑوں گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ ! تم تو پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو، وہاں کے لگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں ؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

غالب

(۲) سر سیّد کا خط مولانا حالی کے نام

جناب مولانا مخدوم و مکرّم۔

شملے میں میرے لیے اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے۔ میرا رمضان سچ مچ عید ہو جائے گا۔ آپ بلا تامل تشریف لائیں، مکان، دل، آنکھیں سب حاضر ہیں۔ موسم یہاں کا اچھا ہے۔ اتفاقیہ علالت دوسری چیز ہے۔ معمولی بیماری کا دور ہونا لازمی ہے۔ سردی بہت نہیں ہے۔ نہایت ملائم، ٹھنڈک ہے۔ بارش اکثر ہوتی ہے جو کسی قدر ناگوار ہے۔ گر ارادہ ہو تو اس عریضے کا جواب فوراً ارقام فرمائیے گا۔

والسلام

خاکسار

سیّد احمد

ڈپٹی نذیر احمد کا خط بیٹے کا نام

میاں بشیر!

جس وقت سے میں آیا تھا، تمھارا اسباب جمع کرنے کی فکر میں تھا، چناں چہ اس وقت اسباب صندوق میں بند کر کے اوپر سے ٹاٹ مڑھ کر بکس میں روانہ کرتا ہوں۔ وہاں سے ریل پر روانہ ہو جائے گا۔ اس ایک بکس میں اتنی کتابیں ہیں کہ اگر آدمی نظر تحقیق سے ان پر عبور حاصل کر لے تو عالم ہو جائے۔ مگر رکھ چھوڑنے کو کتاب اور پتھر برابر ہے، مقدم جماعت کی پڑھائی ہے۔ اس کے یاد کرنے سے جو وقت بچے، اس میں دوسرا کام کرنا چاہیے۔ اس وقت بوجھ اپنے اوپر مت بڑھاؤ، جماعت میں بڑھے رہو۔ کیوں کہ ہم سبقوں میں پیچھے رہنا بڑی بے عزّتی کی بات ہے۔ بڑا انتظام اس کا ہو، انگریزی بول چال اور عبارت انگریزی کے لکھنے میں یعنی انگریزی کمپوزیشن میں ترقّی ہو، سو اُمید ہے، تم نے اس کے لیے مناسب تدبیر کر لی ہوگی۔ اگر وقت کو انتظام سے صرف کرو اور معمول باندھ کر ہر کام وقت پر کرتے رہو تو بافراغت جماعت کی پڑھائی بھی یاد کر لو گے اور پھر بھی اتنا وقت بچے گا کہ اس میں انگریزی کو بڑھاؤ، عربی پڑھو اور اونچی کلاس میں جانے کا حوصلہ کرو۔

دعا گو

نذیر احمد

(۴) اکبر الہ آبادی ریٹائرڈ سیشن جج تھے۔ بہت نیک دل اور دین دار بزرگ ہونے کے علاوہ ایک مشاق شاعر بھی تھے۔ سیدھی سادی زبان میں شعر کہتے تھے مگر زیادہ تر ایسے شعر جن میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ قوم کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح کا پہلو نمایاں ہو۔

ایک دفعہ مولانا شبلی الہ آباد گئے۔ اکبر مرحوم نے ایک "دعوت نامہ" نظم میں بھیجا جو یہ ہے:

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

آخر عمر میں مولانا شبلی کا پاؤں ایک حادثے کی وجہ سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اس سبب سے وہ لنگڑے ہو گئے تھے۔ بے ساکھی کے سہارے چلتے تھے۔ اس لیے معذرت نامہ لکھ بھیجا، جو یہ ہے:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لُطف وکرم سے مجھے انکار نہیں
حلقہ درگوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھِرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

شبلی نعمانی

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- نثری خطوط میں سے آپ نے کس کا خط پسند کیااور کیوں؟
۲- مرزاغالب کے خط میں وہ کون سی خاص خُوبی ہے جو عام طور پر خطوں میں نہیں پائی جاتی؟
۳- مرزاغالب کے طرز پر آپ بھی ایک خط اپنے دوست کولکھیے۔
۴- شبلی نعمانی مرحوم نے اپنے آپ کو تیمور کیوں کہا؟

(ب) مرحوم کے معنی ہوتے ہیں "رحم کیا گیا" (یا جس پر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا ہو) یا جو قابل رحم ہو۔
اس وزن پر عربی کا جو بھی لفظ آتا ہے "اسم مفعول" ہوتا ہے اور اس کے معنی ایسے ہی لیے جاتے ہیں۔
اب ذیل کے لفظوں کے معنی بتایئے اورانھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

مرقوم - معلوم - مجبور - ممنون

(ج) قدیم زمانے میں غلام کے کان میں حلقہ پہنانے کا دستور تھا، تاکہ لوگ دیکھتے ہی پہچان لیں کہ یہ غلام ہے۔
اسی لیے فارسی میں حلقہ درگوش (کان میں حلقہ) کے معنی غلام کے سمجھے جاتے ہیں۔
مولاناشبلی نے انکساری کے طور پر خود کو "حلقہ درگوش" کہاہے۔

حُبِّ وطن

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اُٹھو، اہلِ وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ

کھانا کھاؤ تو جِی میں تم شرماؤ
ٹھنڈا پانی پیو تو اَشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بے زار

نوکروں کی، تمھاری جو ہے غذا
ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پِھرتے ہو
واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی
جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ
کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے ہیں سب برگ وثمر
ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر

جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم وگوش اگر
لو جولی جائے کور و کر کی خبر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

تن درستی کا شکر کیا ہے؟ بتاؤ
رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

عزّت قوم چاہتے ہو اگر
جاکے پھیلاؤ ان میں علم وہنر

ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

قوم کی عزّت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم وزر سے ہے

کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

گر نہیں سنتے قول حالؔی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

مولانا حالؔی

اشارے

۱- یہ مولانا حالی کی نظم ہے جو اُردو زبان کے پہلے "قومی شاعر" تھے۔ یہ مثنوی ہے اور مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں، جس میں کوئی مضمون سلسلہ وار بیان کیا گیا ہو اور جس کے تمام اشعار الگ قافیے کے ہوں۔

۲- قافیہ: شعر کے مصرعوں کے آخر میں دو مختلف الفاظ حروف و حرکات میں یک ساں ہوں تو وہ ایک دوسرے کا قافیہ کہلاتے ہیں۔ مثلاً اس نظم کے شعروں میں دیکھو:

آؤ، جاؤ، شرماؤ، پہناؤ، نادار اور بیزار۔

۳- شاعر نے اس مثنوی میں "وطن کی محبت" کا صحیح مطلب سمجھایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "وطن کے تمام باشندوں سے محبت کرنا اور ان کو راحت و آرام پہنچانا ہر شخص کا فرض ہے۔"

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- وطن کی محبت رکھنے والوں میں کیا خُوبیاں ہوتی ہیں؟

۲- تن درستی کا شکر کس طرح ادا کرنا چاہیے؟

۳- تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے وطن کی خدمت کس طرح کرنی چاہیے؟

قواعد

۱- جاگنا سے جگانا بنا ہے۔ یہ دونوں مصدر ہیں۔ ان کے جملے یہ ہیں:

لڑکا جاگتا ہے۔ ماں لڑکے کو جگاتی ہے۔

دیکھیے پہلے فعل کا مفعول نہیں ہے۔ دوسرے فعل کا مفعول ہے۔ پہلا فعل لازم کہلاتا ہے اور دوسرا فعل متعدی۔ اب نیچے دیے ہوئے فعلوں کو لازم سے فعل متعدی بنا کر جملوں میں استعمال کیجیے۔

سوتا ہے، رویا، دوڑا اور لوٹا۔

۲- ایک ڈالی کے سب ہیں "برگ و ثمر"۔ اس مصرعے میں وطن کو ڈالی سے اور وطن والوں کو برگ و ثمر سے مثال دی گئی ہے۔ اسی طرح دوسری مثال اس بات کے لیے آپ دیجیے۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

(خواجہ حسن نظامی دہلی کے مشہور انشاء پرداز تھے۔ دہلی کی خالص اور پاکیزہ زبان میں انھوں نے ہزاروں مضامین لکھے ہیں۔ مقصد کی بات کو بہت سادہ مگر دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ عبارت میں جگہ جگہ چلبلا پن ہوتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں اصلاحِ اخلاق کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ ذیل کی کہانی ان کی کتاب "غدر دہلی کے افسانے" سے نقل کی گئی ہے)

غدر[1] سے ایک برس پہلے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھر رہے تھے اور بے پروائی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں میں چھپی تھیں، غُلّے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آنکلا اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کر کے عرض کیا کہ "میاں صاحبزادو! ان بے زبان جان وروں کو کیوں ستاتے ہو؟ انھوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ ان کے بھی جان ہے۔ یہ بھی تمھاری طرح دُکھ اور تکلیف کا احساس رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور منھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو، بادشاہوں کو اپنے ملک میں رہنے والوں پر محبت اور مہربانی کرنی چاہیے۔ بادشاہ کے لیے انسان اور جان ور سب ایک ہیں۔ یہ جان ور بھی ملک میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شانِ بادشاہی سے دور نہیں۔"

بڑے شہزادے نے جس کی عمر اٹھارہ برس تھی، شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی۔ مگر چھوٹے نصیر مرزا بگڑ کر بولے "دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ہم کو نصیحت کرنے والا۔ سیر و شکار سب کرتے ہیں۔ ہم نے کیا تو کون سا گناہ کیا؟" فقیر بولا۔ "صاحب عالم! ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے جان وروں کا کرنا چاہیے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے۔ ان ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔ بیس مارو گے تب بھی ایک آدمی کا شکم سیر نہ ہو گا۔"

نصیر مرزا، فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غُلا غلیل میں بھر کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بے چارہ منھ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی"۔ فقیر کے

گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ "وہ تخت کیوں کر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفّاک ہیں۔ لڑکے! تو نے میری ٹانگ توڑ دی۔ خدا تیری ٹانگ توڑ دے اور تجھے اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو۔"

(۱) سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں۔ گولے برس رہے تھے۔ زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ شہر دہلی ویران اور سنسان ہو رہا تھا کہ لال قلعے سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف سے بیس پچیس گورے سپاہی دھاوا کرتے چلے آتے تھے۔ انھوں نے ان نو عمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ شہزادے فرشِ خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا دو شہزادے جاں بہ حق ہو چکے ہیں مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑا اور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا۔ گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرنچیں آگئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہوگئی ہے۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیے اور حراست میں لے کر کیمپ میں بھجوا دیا۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا مرزا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم ہوا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس گیا۔ لال قلعے کے مکین بُرے حالوں میں جنگلوں میں نکل کھڑے ہوئے۔ بہادر شاہ، ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے۔

اس دار و گیر میں پہاڑی کیمپ پر مرزا نصیر الملک رسی سے بندھے ہوئے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہا، "جاؤ، میں نے آپ کی رہائی کے لیے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ جلد بھاگ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔"

مرزا بے چارے پیدل چلنا کیا جانیں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف

ہو لیے۔ تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ابھی دَم بھی نہ لینے پائے تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی جو مرزا کو اپنے ساتھ واپس دہلی لے گئی اور بڑے صاحب کے سامنے پیش کردیا۔ صاحب نے ان کو خرد سال سمجھ کر چھوڑ دیا۔ قید سے نجات پاکر مرزا کچھ دن اِدھر اُدھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخر کار سرکار نے ان کی پانچ روپے ماہ وار پنشن مقرر کردی۔

(۳)

ایک برس کا ذکر ہے۔ دہلی کے بازار چتلی قبر، کمرہ بنگش خاں وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتا دیتا تھا، کولھوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں شاید فالج سے بے کار ہو گئے تھے۔ اس لیے ہاتھوں کو ٹیک کر کولھوں کو گھسٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کرکے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا، ترس کھا کر جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے تھے۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کا نام مرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضے میں برباد کردی اور گداگری پر گزارا ہے۔ مجھ کو ان کے حال سے عبرت ہوتی تھی اور جب ان کا ابتدائی قصّہ جو خود ان کی زبانی سنا تھا، یاد آتا تو دل دہل جاتا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا جس کی ٹانگ میں اُنھوں نے غُلا مارا تھا۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- شہزادے مرزا نصیر نے فقیر سے کیا برتاؤ کیا تھا اور کیوں؟

۲- شہزادے کا کیا حشر ہوا؟

۳- یہ قصّہ کس زمانے کا ہے؟

قواعد

(ب) "ہم نے کیا تو کون سا گناہ کیا؟"

اس جملے میں تو آیا ہے جو "حرف جزا" ہے۔ اس لیے اس سے پہلے "حرف شرط" ہونا چاہیے (جیسا کہ آپ کو معلوم ہے) اس میں اگر (حرف شرط) پوشیدہ ہے تو کے استعمال سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اسی طرح کا جملہ ہے:

"وہ آتے تو کام بن جاتا۔"

اب آپ ایسے پانچ جملے بنائیے۔

سوالات

(ج) ذیل میں کون سی صفت اس قصّے کے لیے مناسب ہو گی؟

افسوس ناک - دل کش - دل چسپ - حسرت ناک اور حسرت بھرا۔

(د) ان الفاظ کے معنی لغت میں دیکھ کر لکھیے:

سفاک، حرارت، مکین، یلغار، دار و گیر۔

(ہ) ان محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

جاں بہ حق ہونا - ترس کھانا - آگ بگولا ہونا - دل دہل جانا۔

ایران کا جاڑا

(مولوی محمد حسین آزاد اُردو کے بڑے اچھے انشاء پرداز تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور لاہور میں تقریباً تراسی سال کی عمر میں ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

اُن کی اُردو سادہ، بامحاورہ اور دل کش ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اظہارِ مطلب کرتے ہیں اور بات میں بات پیدا کر دیتے ہیں۔

ذیل کا مضمون ان کی کتاب "سخن دانِ فارس" کا ایک ٹکڑا ہے جسے انھوں نے ایران کی سیر کے بعد لکھا تھا)

دفعتہً ہوا بند ہوئی۔ اَبر ساگھر آیا۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی۔ پھر سفید غبار سا برستا ہوا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر، دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری۔ صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور ساتھ ہی سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے پڑے تھے، خالی جھاڑیاں کھڑی ہیں۔ جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے۔ وہ بھی سیاہ رنگ، جیسے بجلی مار الوہا۔ ایک دو دن بعد برف باری شروع ہو گئی مگر کس طرح؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دھنک رہا ہو۔ ایک رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار، زمین، آسمان، تمام سفید، وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشے کی شاخیں ہو گئیں۔

پہاڑوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے۔ جنگلوں میں برف سے رستے رُک گئے۔ سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے۔ میدان، کھیت، گلی کوچے، گھر گھر میں قد آدم برفیں چڑھ گئیں۔ بازاروں میں سناٹا، کارخانے بند، غریب کاری گروں کے کاروبار ان کے ہاتھوں سے بھی سوا ٹھنڈے۔ کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں۔ جلدی گراؤ نہیں تو گھر بیٹھا۔ امراء کے غلام نوکر، مزدور لکڑی کے پنج شاخے اور پھاؤڑیاں لیے ہوئے ہیں اور برف گرا رہے ہیں۔ غریب غربا اپنا کام آپ ہی کرتے ہیں۔ پھر اپنے گھروں میں آگھستے ہیں۔ آگ بغیر گزارا نہیں۔ انگیٹھی بیچ میں لے بیٹھتے ہیں۔ جن کو خدا نے دیا ہے، ان کے یہاں آتش دان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں۔ کمروں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ گھروں میں دُنبے کاٹتے ہیں، مرغ ذبح کرتے ہیں۔ نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دم دیتے ہیں، ان کی یخنیاں

پیتے ہیں۔ کلے پائے اور شب دیگیں پکا پکا کر کھاتے ہیں۔ لیکن باہر تمام ویرانہ ہے۔ کھیت اور باغ سب سنسان۔ گیدڑ، لومڑی، خرگوش، بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس رہتے ہیں۔

"گرگ آشتی"۔ بھیڑیوں کو اس موسم میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ وہ گوشت کے سوا اور کچھ کھاتے نہیں اور کسی قسم کا ذخیرہ رکھتے نہیں۔ باہر برف کی کثرت سے کتا تک نظر نہیں آتا۔ گلے سب بند ہو جاتے ہیں۔ یہ دس دس، بیس بیس جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر ہر بھیڑیا اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی آنکھ سب پر پڑے۔ ہر چند بھوک، پیاس، تھکن سے تنگ ہوتے ہیں، مگر ایک دوسرے پر اعتبار نہیں۔ اس لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخر نیند تو ظالم ہے، کسی کی ذرا آنکھ جھپکی اور جتنے بیٹھے تھے جھٹ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فوراً پھاڑ چیر تکا بوٹی کر کے کھا ہی جاتے ہیں۔ اس لیے اہلِ ملک نے اصطلاح نکالی ہے "گرگ آشتی" یعنی اس بد ذات جان ور کے ملاپ کا بھی اعتبار نہیں۔

ملک کے لوگ اس برف کے کیڑے ہیں۔ انھیں یہ سردی کچھ بہت دُکھ نہیں دیتی، اس لیے بازار چلتے رہتے ہیں۔ حاجت مند بچارے یا اکثر مصیبت کے مارے سفر بھی کرتے ہیں۔ ان کے نمدی چغوں پر برف پڑی ہوئی، پلکوں پر برف جمی ہوئی، مونچھیں اور داڑھی میں گویا شیشے کی سلائیاں لٹکتی ہیں۔ اس عالم میں پرند، جان ور بھی کم نکلتے ہیں۔ البتہ خاص قسموں کے کوّے اور بعض جان ور اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان کی پیٹھ اور بازوؤں پر برف جمی ہوتی ہے۔

سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- ایران میں جاڑے کے موسم میں درختوں کا کیا حال ہوتا ہے؟

۲- غریب اپنا جاڑا کس طرح گزارتے ہیں؟

۳- "گرگ آشتی" کا کیا مطلب ہے؟ یہ لفظ اس مطلب کے لیے کیوں بنایا گیا ہے؟

قواعد

"ہر چند بھوک، پیاس، تھکن سے تنگ ہوتے ہیں مگر ایک دوسرے پر اعتبار نہیں۔" اس جملے میں "ہر چند" کی جگہ "اگرچہ" رکھ دیں تب بھی مطلب میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ ہر چند اور اگرچہ کے ایک ہی معنی ہیں اور جب یہ استعمال ہوتے ہیں تو ان کا جواب مگر اور لیکن والا جملہ ہوتا ہے۔

۱- ہر چند اور اگرچہ والے دو جملے بنایئے۔

۲- ذیل کے محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا - ٹوٹ پڑنا

۳- "گرگ آشتی" کا مطلب بتایئے اور یہ واضح کیجیے کہ یہ لفظ کس وجہ سے بنایا گیا۔

۴- آپ ایسی ہی زبان میں "بارش کی کیفیت" کے عنوان سے مضمون لکھیے۔ کوشش کیجیے کہ عبارت کے جملے چھوٹے چھوٹے ہوں۔

آدمی نامہ

دنیا میں پادشہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس وگدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چِلاّ کے آدمی کو پُکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے اے میاں!
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خُطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز، یاں
اور آدمی ہی ان کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو، لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچّا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اِک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے ان کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں
کم خواب، تاش، شال، دُوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزّت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب سے جو بُرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

(نظیراکبرآبادی)

اشارے

۱- یہ نظم نظیراکبرآبادی کی ہے۔ان کا انتقال سنہ ۱۸۳۰ء میں ہوا۔انھوں نے اُردو میں معمولی معمولی چیزوں پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً: پیسا، روٹی۔
ان کی نظموں میں تصنع نہیں ہوتا۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں، بے تکلف سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اس خُوبی کے ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔

۲- نظیراکبرآبادی کے زمانے میں اُردو پرانی تھی۔اس وقت کے بعض الفاظ اور محاورے آج کل نہیں بولے جاتے۔ جیسے اس نظم میں ہے "اُتارے ہے"، "پکارے ہے"۔ آج کل اُتارتا ہے، پکارتا ہے بولتے ہیں۔اسی طرح "کہاتا ہے" نہیں بولتے "کہلاتا ہے" بولتے ہیں۔

مشق

۱- ان لفظوں کی ضد بتایئے:

گدا، زردار، سچا، جھوٹ اور غرب۔

۲- نیچے کے الفاظ صفت ہیں۔ ان کے ساتھ موصوف لگایئے، پھر جملوں میں استعمال کیجیے:

زرق برق، بے نور، سچا، سچی اور مغربی۔

۳- چِلاّ کے آدمی کو پکارے ہے آدمی

اور سن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ان دونوں مصرعوں میں کس کی طرف اشارہ ہے؟

۴- "دنیا میں کیسے کیسے آدمی ہیں۔"

۵- اس عنوان سے ایک مضمون لکھیے۔

نصوح کا خواب

پیدائش: ۱۸۳۱ء وفات: ۱۹۱۲ء

(مولوی نذیر احمد دہلوی عربی کے عالم اور اُردو کے ماہر انشاء پرداز تھے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح کے لیے قصّے کہانیوں کی کئی دل چسپ کتابیں اُردو میں لکھی ہیں۔ ان میں ایک کتاب کا نام "توبۃ النصوح" ہے یعنی نصوح کی توبہ۔

اس قصّے میں یہ بتایا گیا ہے کہ نصوح ایک دنیادار اور دین سے بے پروا آدمی تھا۔ اسے ہیضہ ہو گیا، دوا دی گئی تو گہری نیند آگئی۔ اسی حالت میں اس نے خواب دیکھا کہ قیامت کا میدان ہے اور لوگ سخت پریشانی کے عالم میں ہیں۔ اتنے میں اس کا باپ نظر آجاتا ہے۔ وہ دوڑ کر قدموں میں گر جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو ہوتی ہے، اسے مولوی نذیر احمد کی زبان میں پڑھیے)

بیٹا: یا حضرت! ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں۔ آپ یہاں کہاں؟

باپ: میں اپنے گناہوں کی جواب دہی میں پکڑا گیا ہوں۔ یہ مقام جو تم دیکھ رہے ہو "دارالجزاء" ہے۔ خداوند تعالیٰ اس محکمے کا حاکم ہے۔

بیٹا: حضرت! آپ تو بڑے متقی، پرہیز گار، خدا پرست، نیکوکار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا الزام!

باپ: گناہ بھی ایک دو نہیں، سیکڑوں ہزاروں، دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال، کیسی فضیحت اور رسوائی سے بھرا ہوا ہے اور میں اس کو دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی برأت کی پیش کروں گا۔

یہ وہ کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اُسی کو دنیا کے خیالات کے مطابق فردِ قرار دادِ جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو خراب تھا۔ شرک اور کفر، نافرمانی، ناشکری اور بغاوت، بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و غیبت، طمع و حسد، مردم آزاری، نفاق و ریا، غرض دنیا کا کوئی الزام نہ تھا کہ اس میں نہ ہو۔ چوں کہ نصوح کے دماغ میں خیالات گونج رہے تھے۔ لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیراتِ ہند کی دفعہ اور ضمن ڈھونڈنے، سو بجائے دفعات تعزیرات کے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔ متعجب ہو کر باپ سے پوچھا:

......یا حضرت! پھر کیا آپ ان تمام جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں؟

باپ: سب کا۔

بیٹا: کیا آپ، حضور حاکم اقرار کر چکے ہیں؟

باپ: انکار کی گنجایش ہی نہیں۔ میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر ہے کہ اگر میں انکار بھی کردوں تو پذیرا نہیں ہو سکتا۔

بیٹا: جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔

باپ: اوّل تو وہ شخص کراماً کاتبین اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل ان سے مخفی نہیں۔ جتنی باتیں کہتے ہیں پتے کی اور کہتے کیا ہیں میرا روزنامچہ عمری لکھتے گئے ہیں۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں تو حرف بہ حرف صحیح اور درست پاتا ہوں۔ دوسرے یہی اعضاء ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان کوئی میرے کہنے کا نہیں۔ سب کے سب مجھ سے منحرف ہیں۔ سب کے سب مجھ سے برگشتہ، میری مخالفت پر آمادہ، میری تذلیل پر کمر بستہ ہو رہے ہیں۔

بیٹا: آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں؟

باپ: میں ان کو غلطی سے اعوان وانصار، بھیدی اور رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے۔ انہوں نے وہ سلوک میرے ساتھ کیے کہ تسمہ لگا نہیں رکھا۔

بیٹا: آپ کا کیا حال ہے؟

باپ: جب سے دنیا کو چھوڑا، قبر کی حوالات میں ہوں۔ تنہائی سے جی گھبراتا ہے۔ انجام کار معلوم نہیں۔ شب و روز اسی اندیشے میں پڑا گھلتا رہتا ہوں۔ حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مگر صبح و شام ہر روز آتے جاتے قید خانے کے پاس ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ دوزخ وہی ہے۔ وہاں کی تکلیف دیکھ کر اور سن کر ہوش اڑے جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات میں رہنے کا حکم ہوتا!

بیٹا: پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا؟

باپ: خدا نہ کرے کہ پیش ہو۔ جو دن حوالات میں گزرتا ہے، غنیمت ہے۔ اوّل اوّل جب میں حوالات میں آیا تو اعمال نامہ مجھ کو حوالے کر دیا گیا۔ بس اِسی کو دیکھا کرتا ہوں۔ نجات کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی۔

بیٹا: بھلا کس طرح ہم لوگ آپ کی مصیبت میں کام آسکتے ہیں؟

باپ: اگر میرے لیے عاجزی اور خلوص سے دعا کرو تو کیا عجب ہے کہ مفید ہو۔ ابھی میرے ہم سائے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی ہے، اس پر بھی بہت سے الزام تھے۔ مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجے کا انصاف ہے، رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے۔ اس شخص کے پس ماندوں نے اس کے واسطے بہت زاری و نالی کی تو پرسوں یا ترسوں اُس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب تجھ پر مخفی نہیں رہے۔ مگر ہمارے کئی بندے معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑ گڑاتے ہیں اور تیرے ہی زن و فرزند ہیں۔ ہم کو تیری یہی اک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں دین داری کا بوج بویا ہے۔ ہم نے تیری خطا معاف کی۔ سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دُعائے خیر کی؟

بیٹا: جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شدّ و مدّ کے ساتھ ہوتا ہے گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے۔ آپ کی عنایتیں، آپ کی شفقتیں، جب تک جییں گے، یاد کریں گے۔ رسمِ دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ شاید میرے منھ پر خوشامد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اِس مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا۔ دُعا کے بارے میں غلط بات کیوں کر عرض کروں۔ اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ آپ تو صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے؟

باپ: کیوں نہیں، یہ انھیں اعمال کی بدولت ہے کہ تم مجھ کو اس حالت میں دیکھتے ہو۔ ورنہ بہتیرے مجھ سے زیادہ تکلیف میں ہیں۔ حوالات میں جیل کی سی ایذا ہے۔ مگر یہاں اعمال میں خلوص نیت شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی، کھوٹے روپے، نمازیں بے حضور قلب، اکارت گئیں اور روزے چوں کہ پابندیٔ رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا، خالی فاقے کے شمار میں در آئے۔

بیٹا: پھر اس دربار میں کچھ سفارش کا دخل نہیں؟

باپ: استغفر اللہ کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں۔ نفسا نفسی پڑی ہے۔ ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے۔ دوسروں کی نجات تو کوئی کیا کرے گا پہلے آپ تو سرخ رو ہو لے۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- ذیل کے الفاظ کے معنی لغت میں تلاش کر کے لکھیے:

مفارقت، فضیحت، شرک، تعزیرات، جاسوسِ ایزدی، تذلیل، اہتمام اور خلوص نیّت۔

۲- "دار الجزاء" دار کے معنی گھر یا مقام یا جگہ اور "الجزاء" کے معنی بدلہ۔ اسی لیے "دار الجزاء" کے معنی "بدلے کا گھر" یا بدلے کی جگہ۔

اب آپ عمل، آخرت، حکومت، امن سے پہلے دار لگا کر معنی کیجیے۔

۳- "فرد قرار داد جرم" اس قرار داد کو کہتے ہیں جو مجسٹریٹ کی طرف سے مجرم کو دیا جاتا ہے اور جس پر اس کا جرم لکھا ہوتا ہے۔

(ب) مندرجہ ذیل لفظوں کے متضاد لفظ بتائیے:

نیکوکار، کفر، نافرمانی، مخالفت، رہائی اور انصاف

(ج) مندرجہ ذیل جملوں کی تشریح کیجیے:

۱- دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے۔

۲- بجائے دفعات تعزیرات کے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔

۳- اعمال میں خلوص نیّت شرط ہے۔

(د) خالی جگہ میں مناسب لفظ لکھیے:

۱- .... جاسوسِ ایزدی تھے۔

۲- عاجزی اور .... سے دعا کی جائے تو قبول ہوتی ہے۔

۳- ایک دن اپنے اعمال کی .... کرنی ہوگی۔

۴- کسی کتب خانے سے توبۃ النصوح لے کر پڑھیے۔ بہت ہی دل چسپ کتاب ہے اور بڑی پیاری زبان میں لکھی گئی ہے۔

اسلامی حکومت کا امیر سب کا خادم ہوتا ہے

اندھیری رات تھی، ہر طرف سنّاٹا تھا۔ مدینہ منوّرہ کی ساری آبادی آرام کی نیند سو رہی تھی، مگر ایک شخص بیدار تھا۔ وہ شہر کی سنسان گلیوں میں چکر لگا رہا تھا۔ ہر مکان کے قریب تھوڑی دیر رُکتا اور اپنا اطمینان کر کے آگے بڑھ جاتا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کوئی شخص مصیبت یا تکلیف میں تو نہیں؟

شہر والوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو وہ شخص باہر نکلا۔ اچانک کسی عورت کے کراہنے کی آواز کان میں آئی۔ وہ تیزی سے اس سمت کو چلا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دور پر ایک خیمہ نظر آیا جہاں سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ خیمے کے باہر ایک بدّو بیٹھا تھا جس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ شخص بدّو کے قریب گیا۔ اس نے دریافت کیا، کیوں بھائی کیا ماجرا ہے؟ کیا خیمے کے اندر کوئی عورت بیمار ہے؟ بدّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دوبارہ پوچھا تو بدّو نے غصے سے کہا: "بکواس نہ کرو، جاؤ اپنی راہ لو۔ تم کو پوچھنے سے کیا مطلب ہے؟"

وہ شخص سمجھ گیا یہ بے چارہ کسی سخت مصیبت میں ہے اور پریشانی میں اسے کچھ نہیں سُوجھ رہا ہے۔ اُس نے پھر بہت نرمی سے کہا: "بھائی! تم پریشان معلوم ہوتے ہو۔ اپنی تکلیف تو بتاؤ، ممکن ہے میں تمھاری کچھ خدمت کر سکوں۔"

اس شخص کی ہمدردانہ گفتگو نے بدّو کے غصّے کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس نے شرمندہ ہو کر کہا: "بھائی معاف کرنا میں سخت پریشانی میں ہوں، میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ معلوم نہیں میں نے ابھی کیا کیا تمھیں کہہ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ "تہامہ" کے بدّو ہیں۔ ہم نے سنا ہے ہمارے خلیفہ حضرت عمرؓ غریبوں کے بڑے ہمدرد ہیں۔ ہم اتنا راستہ طے کر کے ان سے مدد حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اس وقت میری بیوی کو بچّہ ہونے والا ہے۔ وہ درد میں مبتلا ہے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟" اس شخص نے بدّو کو دلاسا دیا اور کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ میں سب انتظام کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہاں سے

چل پڑا۔ تیزی سے اپنے گھر پہنچا اور اپنی بیوی کو سب حال سنایا اور کہا: فوراً تیار ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ بدّو کو زیادہ انتظار کرنا پڑے اور وہ مایوس ہو جائے۔ جو کچھ ضروری سامان اس وقت ممکن ہو ساتھ لے لو۔ بدّو بہت غریب معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ کچھ کھانا ہو تو رکھ لو۔ اتنے میں، میں اونٹ کو تیار کرتا ہوں تاکہ جلد پہنچ جائیں۔

بدّو بے چارہ انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی پہنچ گئے۔ بیوی تو خیمے کے اندر چلی گئی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ شخص بدّو کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "بھائی! اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ انسان کو چاہیے کہ مصیبت کے وقت صبر سے کام لے، ہمت نہ ہارے۔"

تھوڑی ہی دیر میں خیمے کے اندر سے آواز آئی۔ "امیر المؤمنین! اپنے دوست کو خوش خبری سنا دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا فرمایا ہے۔"

بدّو یہ خبر سن کر خوش تو بہت ہوا مگر "امیر المؤمنین" کا لفظ سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ سوچنے لگا یہی حضرت عمرؓ تو نہیں۔ واقعی یہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ تھے۔ بدّو نے خوف سے کانپتے ہوئے نظر اُٹھا کر آپ کی طرف دیکھا۔ آپ بدّو کی پریشانی کی وجہ سمجھ گئے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: گھبراؤ نہیں، خدا کا شکر ہے کہ تمھاری پریشانی دور ہو گئی۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ آج تم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟

"یا امیر المؤمنین! میں تو اس قدر پریشان تھا کہ کھانے کا ہوش ہی نہ تھا اور میرے پاس کچھ کھانے کو تھا بھی نہیں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "لو یہ کھانا موجود ہے۔ اطمینان سے کھاؤ۔" بدّو بھوکا تو تھا ہی، خُوب شکم سیر ہو کر کھایا۔

حضرت عمرؓ رُخصت ہونے لگے تو بدّو سے فرمایا۔ بھائی! میں بیت المال سے تمھاری مدد کروں گا۔ ان شاء اللہ تمھارا افلاس دور ہو جائے گا۔ یہ سن کر بدّو بے اختیار رونے لگا اور کہنے لگا کہ میرے پاس الفاظ نہیں جس سے میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "بھائی، میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔ تمھاری خدمت کرنا مجھ پر فرض تھا، وہ میں نے ادا کیا۔ اپنا فرض ادا کرنا کسی پر احسان نہیں ہوتا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے خدمت کی توفیق بخشی۔"

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- حضرت عمرؓ کون تھے؟

۲- بدّو، امیر المؤمنین کا لفظ سن کر کیوں گھبرایا؟

۳- "اپنا فرض ادا کرنا کسی پر احسان نہیں ہوتا۔" اس جملے کی تشریح کیجیے۔

قواعد

کا، کی، کے، قواعد میں حروفِ اضافت کہلاتے ہیں۔ یہ دو اسموں کے درمیان آتے ہیں۔ مثلاً: "بدّو کی بیوی" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کا تعلق یا رشتہ بدّو سے ہے۔

جس اسم کو نسبت دی جاتی ہے، اسے مضاف کہتے ہیں اور جس کی طرف نسبت دی جائے وہ مضاف الیہ ہوتا ہے۔ اس لیے بدّو "مضاف الیہ" ہے اور بیوی "مضاف"۔ اُردو میں مضاف اگر مذکر ہو تو اس سے پہلے "کا" لفظ استعمال ہوگا۔ (مثلاً خدا کا شکر) اگر مضاف جمع مذکر ہو تو "کے" لائیں گے (مثلاً مدینہ کے لوگ) مضاف اگر مؤنث ہو تو چاہے واحد یا جمع، دونوں صورتوں میں "کی" استعمال ہوگا۔ (مثلاً بدّو کی پریشانی اور بدّو کی پریشانیاں)۔

۱- نیچے کے لفظوں کو مضاف کی صورت میں لاکر جملے بنایئے:

شکریہ، افلاس، گلیاں، توفیق اور الفاظ۔

۲- ان محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، دلاسا دیا، ہمت ہارنا، بھونچکا سا رہ گیا اور شکم سیر ہونا۔

۳- اس مضمون میں ایک جملہ آیا ہے۔ "اتنے میں، میں اس اونٹ کو تیار کرتا ہوں۔" یہاں "اتنے میں" کے معنی ہیں "اتنی دیر میں۔"

اب آپ دو جملے ایسے بنایئے جن میں "اتنے میں" اسی معنی میں آئے۔

۴- اس قصّے کو اپنے جملوں میں لکھیے۔

آسمان اور تارے

یہ تارے جو ہیں آتے جاتے ہوئے
چمکتے ہوئے، جگمگاتے ہوئے

نظر آرہے ہیں عجب شان سے
ہیں لٹکے ہوئی سقفِ ایوان سے

چراغ ایسے روشن جو بِن تیل ہیں
یہ تیری ہی قدرت کے سب کھیل ہیں

یہ لعل وگہر ہیں جو بکھرے پڑے
زمیں سے بھی ان میں ہیں اکثر بڑے

نظر میں جو اتنے سے آتے ہیں یہ
بہت دور چکر لگاتے ہیں یہ

پڑے اپنے چکر میں ہیں گھومتے
ترے حکم کے ذوق میں جُھومتے

یہ قائم ہیں تیری ہی تقدیر سے
بندھے ہیں بہم سخت زنجیر سے

وہ زنجیر کیا ہے؟ کشش باہمی
نہ اس میں خلل ہے نہ بیشی کمی

عجب تو نے باندھی ہے یہ باگ ڈور
تُلا سب کا رہتا ہے آپس میں زور

یہ سب لگ رہے ہیں اِسی لاگ پر
لگاتے ہیں چکر اِسی باگ پر

نشے میں اطاعت کے سب چُور ہیں
کہ قانونِ قدرت سے مجبور ہیں

(مولوی محمد اسماعیل میرٹھی)

اشارے

۱- یہ نظم مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ہے۔ یہ نارمل اسکول آگرہ میں اُستاد تھے۔ بڑے پائے کے عالم اور اُردو کے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ یہ قدرتی مناظر اور واقعات کا بیان صاف اور سادہ لفظوں میں کرتے ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۲- نظم میں "تیری" یا "تیرے" جہاں ہیں، ان سے خطاب اللہ تعالٰی کی طرف ہے۔

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- آسمان کو سقفِ ایوان کیوں کہا گیا ہے؟

۲- لعل و گہر سے کیا مراد ہے؟

۳- اس نظم میں تاروں کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کون سی بات آج کل کی سائنس کے مطابق ہے؟

۴- آخری شعر کا مطلب واضح کیجیے۔

۵- "یہ قایم ہیں تیری ہی تقدیر سے"
اس مصرعے میں "تقدیر" کے کیا معنی ہیں؟

۶- ان لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے:
بن تیل، ذوق، نشے میں چور، مجبور، لاگ۔

سب سے بڑا اسلامی شاعر

یوں تو اسلامی دنیا میں بہت سے شاعر ہو چکے ہیں لیکن اس صدی میں جس شاعر نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور ان میں اسلامی جوش پیدا کیا، وہ ڈاکٹر اقبال تھے۔ انھوں نے جنوبی ایشیا، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو قرآن کا پیغام سنایا اور بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ ساتھ ہی دوسری قوموں کو بھی دعوت دی کہ امن، انسانیت اور تہذیب کی ترقّی چاہتے ہو تو قرآن پڑھو اور حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کی زندگی کا مطالعہ کرو۔

اقبال نے اپنی نظموں میں خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ تم دنیا میں بہترین قوم ہو۔ کسی اور قوم کے محکوم بن کے نہیں رہ سکتے۔ جس طرح ہمارے نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ سب نبیوں میں اعلیٰ ہیں، اِسی طرح ہم بھی سب قوموں میں اعلیٰ ہیں۔ اپنے اخلاق میں ہمیں سب قوموں سے بلند ہونا چاہیے اور ساری دنیا میں امن و سلامتی پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ان باتوں کو سمجھانے کے لیے انھوں نے اُردو، فارسی اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ فارسی اور اُردو میں زیادہ تر نظمیں ہیں۔

بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ان کی اُردو کتابوں کے نام ہیں۔ نظموں کی ان کتابوں میں انھوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی طریقِ زندگی بہت مؤثر اور دل نشین انداز میں سمجھائے ہیں۔

اسلام کے یہ نام ور فرزند سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں اللہ نے انھیں اپنی رحمت میں لے لیا۔ ان کے بزرگ کشمیری تھے۔

اقبال نے اپنا بچپن سیالکوٹ میں گزارا اور وہیں فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ پھر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں بھی علم کی پیاس نہ بجھی تو انگلستان اور جرمنی گئے۔ قانون اور ادب کی سب سے بڑی سندیں حاصل کیں۔ ۱۹۰۸ء میں اپنے وطن لوٹ آئے تو عالموں نے ان کی علمی لیاقت کی بنا پر انھیں علامہ کہا یعنی بہت بڑا عالم۔

علامہ اقبال بچپن ہی میں قرآن مجید پڑھ چکے تھے۔ روزانہ صبح اس کی تلاوت کرتے تھے۔ اپنے والد مرحوم کی ایک نصیحت کا اکثر ذکر فرماتے تھے کہ: "انھوں نے یہ ہدایت کی تھی کہ جب قرآن پڑھو تو دل میں یہ خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب میرے لیے بھیجی ہے اور خود مجھ سے فرما رہا ہے۔" جب میں نے ان کی اس بات پر عمل کیا، تب سے مطلب سمجھنے کی بھی کوشش کرتا رہا۔ اس سے میری عقل بڑھتی گئی اور غور و فکر کی عادت ہو گئی۔

علامہ اقبال نے اپنی ایک فارسی نظم میں اپنے لڑکپن کا ایک درد بھرا واقعہ بیان کیا ہے جو بہت سبق آموز ہے۔ لکھا ہے کہ ایک دفعہ دروازے پر ایک محتاج کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔ جب وہ نہ ٹلا تو چھڑی کی نوک سے اسے ہٹایا۔ کہا "ہٹ جا یہاں سے۔"

اتفاق کی بات اتنے میں والد مرحوم وہاں پہنچ گئے۔ بیٹے کی یہ حرکت دیکھ لی۔ انھیں بڑا صدمہ ہوا۔ فرمایا "تم نے اسے حقیر سمجھ کر جھڑکا اور چھڑی سے ہٹایا ہے۔ کل جب قیامت ہوگی، حضور سرکارِ دوعالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کے دربار میں اللہ کے بڑے بڑے نیک بندے، انبیاء، اولیاء، بادشاہ، شہنشاہ حاضر ہوں گے۔ ان کے سامنے حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ فرمائیں گے کہ تیرے در پر ایک غریب محتاج گیا تھا تو تیرے بیٹے نے اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا تھا۔ بیٹے! بتاؤ اس وقت میرا کیا حال ہوگا؟ اتنے بڑے دربار میں رُسوا ہو جاؤں گا۔ اس رسوائی کے بعد میرا کہاں ٹھکانا ہوگا اور مجھے کہاں پناہ ملے گی؟"

وہ یہ کہہ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔ علامہ اقبال حیران، نادم اور پریشان تھے۔ آخر معافی مانگی اور توبہ کی۔ ایسی ہی تعلیم پر عمل کر کے نیک انسان بنے اور عزّت پائی۔ ایسی عزّت کہ دنیا کے بڑے درجے کے آدمی لاہور جاتے ہیں تو علامہ اقبال کے مزار کی زیارت ضرور کرتے ہیں۔ پُھول چڑھاتے ہیں اور مسلمان ہوں تو فاتحہ اور درود پڑھ کر ان کی روح کو ثواب کا تحفہ بھیجتے ہیں۔

علامہ اقبال قرآنی تعلیم کے شیدائی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہی چیز اچھی ہے جو اللہ کو پسند ہو اور جو چیز اسے پسند نہ ہو، وہی بُری ہے۔ اس لیے تم قرآن میں یہ تلاش کرو کہ وہ کون کون سی چیزیں پسند کرتا ہے، بس اُنھی کو اختیار کرو۔ اس سے اللہ کی خُوش نُودی حاصل کر لو گے۔

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- اقبال کو علامہ کیوں کہا جاتا ہے؟
۲- علامہ اقبال نے اسلام کی کیا خدمت کی؟
۳- قرآن پاک کے بارے میں علامہ اقبال کا کیا ایمان تھا؟
۴- آخری دونوں پیراگراف اپنی کاپی میں نقل کیجیے اور اس میں جتنے فعل ماضی آئے ہیں، انھیں فعل حال سے بدل دیجیے۔
۵- آپ بھی علامہ اقبال کے مختصر حالات پر ایک مضمون لکھیے۔

حجِ اکبر

(یہ دل چسپ اور سبق آموز افسانہ منشی پریم چند کا لکھا ہوا ہے۔ منشی جی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ماہر اور انشاء پرداز تھے۔ ان کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے سب افسانے اصلاحِ معاشرے کے لیے ہوتے ہیں۔ زبان اور طرزِ بیان اتنا دل کش ہوتا ہے کہ کوئی افسانہ شروع کریں تو ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا)

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچّے کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بچّے کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنی برادری والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت، اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچّہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروّت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے ہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچّے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کھچڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملے میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اس کی لائی ہوئی چیزوں کو گھنٹوں دیکھتی رہتی اور بار بار پوچھتی رہتی۔ اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمت سے دیتی لیکن جب کبھی زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی۔ قسمیں کھاتی، صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ یکایک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو وہ لپکی ہوئی گھر کی جانب چلی۔ شاکرہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے کہا، بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی اور باتیں کرنے لگی۔

شاکرہ اس جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے، تمھیں سیر سپاٹے کی سُوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچّے کو گود میں لینے لگی پر شاکرہ نے جِھڑک کر کہا رہنے دو۔ یہ تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہیں سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا اور دروازے کی طرف چلی۔ لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے

چھین لیا اور بولا۔ تمھارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھاؤ۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں۔ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولی "بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت تو پاؤ گھنٹے کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا اور دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تو نہیں ہے۔"

شاکرہ: تو یہاں تمھاری کون پرواہ کرتا ہے۔ تمھاری جیسی مامائیں گلی گلی کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ: ہاں، خدا آپ کو سلامت رکھے، مامائیں، دائیاں بہت ملیں گی، جو کچھ خطا ہوئی ہو تو معاف کیجیے گا۔ میں جاتی ہوں۔

شاکرہ: جا کر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کر لو۔

دایہ: میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائی منگوا دیجیے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آ گئے۔ پوچھا کیا ہے؟

دایہ: کچھ نہیں، بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔

صابر حسین خانگی تردّدات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچّے۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ بات کیا ہوئی؟

شاکرہ: کچھ نہیں۔ اپنی طبیعت۔ جی نہیں چاہتا، نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بِک تو نہیں گئے۔

صابر: تمھیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سُوجھتی ہی رہتی ہے۔

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لب ریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچّے کو گود میں لے کر پیار کر لوں۔ پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازے تک آیا لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو وہ مچل کر زمین پر لوٹ گیا اور انّا انّا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا، پیار کیا، گود میں لینے کی کوشش کی، مٹھائی کا زور دیا، میلا دکھانے کا وعدہ کیا، اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوّا کی دھمکی دی۔ مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آگیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا اور آ کر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔ نصیر کے منھ اور گال لال ہو گئے۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آخر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سوچا تھا تھوڑی دیر میں بچّہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انّا انّا کی رٹ

لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچّے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھالیا اور بہلانے لگے۔ اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے لے جاتے۔ نِت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔

برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدّت کی گرمی، کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا، نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود رہتا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینے پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورتِ غم بنے بچّے کو پُر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ اُنھیں اس سے ایک نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ نصیر کی اس ساری بیماری کا الزام اس کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف، سفلہ مزاج، بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے ہیں۔ شاید انھی کی دوا سے فائدہ ہو۔"

صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا۔ بڑے حکیم ہی نہیں اگر لقمان بھی آجائیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

شاکرہ: تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہیں ہو گی؟

صابر: بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔

شاکرہ: تمھیں تو وہی دُھن سوار ہے۔ کیا عباسی امرت پلا دے گی؟

صابر: اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی۔ بچّے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ: چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان پر لاتے ہو۔ اگر ایسی ہی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر: ہاں تو میں جاتا ہوں مگر یاد رکھو یہ خون تمھاری گردن پر ہو گا۔ اگر لڑکے کو پھر تن درست دیکھنا چاہتی ہو تو اسی عباسی کے پاس جاؤ اور اس کی منّت کرو، التجا کرو۔ تمھارے بچّے کی جان اسی کے رحم پر ہے۔ شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھی۔

صابر حسین نے پوچھا۔ "کیا مرضی ہے؟ جاؤں اسے تلاش کروں؟"

شاکرہ: تم کیوں جاؤ گے، میں خود چلی جاؤں گی۔ میں نے شرم کے مارے تم سے نہیں کہا ہے لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتا معلوم ہوتا تو میں کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی

ناراض ہو، لیکن نصیر سے اسے محبت ہے۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ تم منّت کرنے کو کہتے ہو، میں تو اس کے پیروں پر سر رکھ دوں گی۔ اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تَر کر دوں گی اور جس طرح راضی ہو گی راضی کر لوں گی۔

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں۔ مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہم دردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے۔ "میں تمھارا جانا مناسب نہیں سمجھتا، میں خود ہی جاتا ہوں۔"

(۲)

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب پودا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں جھاڑ دیں۔ مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین مرتبہ اُبٹن ملتی کہ بچّہ خُوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچّے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچّے کی کم خوراکی کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظرِ بد سے بچانے کے لیے تعویذ گنڈے لاتی۔

رات جوں توں کر کے کاٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو لگا رہی تھی یکایک تازہ حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ منّا یاد آ گیا۔ آج حلوہ کون کھائے گا۔ آج گود میں بیٹھ کر کون چکھے گا۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں، پر آدھے راستے سے لوٹ گئی۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل اُچاٹ رہتا، نہ کھانے کی فکر تھی، نہ کپڑے کی۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آ گئے۔ محلے میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس پالتو چڑیا کی سی تھی جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشے کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا ایک بہانہ مل گیا۔ آمادۂ سفر ہو گئی۔

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ہلکی ہلکی پُھوار پڑ رہی تھی۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے، کچھ اپنے گھروں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کا دامن پکڑے ہوئے تھی۔

عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اُترتا۔ لوٹ کر اسے دیکھنے ضرور جاؤں گی۔ یا اللہ کسی طرح گاڑی چلے، معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں

دیر کر رہے ہیں۔

یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور کپڑے تر بتر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے۔ "کیوں عباسی تم بھی حج کو چلیں۔"

عباسی نے انکسار سے کہا۔ "ہاں یہاں کیا کروں، زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ معلوم نہیں آنکھیں کب بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منھ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچّھی طرح ہیں؟"

صابر: "اب تو جا رہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی؟ اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔" عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی: "کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟"

صابر: اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتے تک تو شب و روز انّا انّا کی رٹ لگاتا رہا۔ اب ایک ہفتے سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا، کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمھاری منّت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمھیں دیکھ کر ہی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن تمھارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منھ سے چلنے کو کہوں۔ تمھارے ساتھ سلوک ہی کون سا کیا تھا کہ میں اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا خیال ہے۔ جاؤ اس کا خدا حافظ، حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی۔ ورنہ مشیئتِ ایزدی سے کیا چارہ۔

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہو گیا۔ دل سے دعا نکلی، اللہ میری جان تیرے صدقے۔ میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔ رقت سے گلا بھر آیا۔ آہ! نہ معلوم بے چارے کی کیا حالت ہے۔ اندازِ وحشت سے بولی۔ "دودھ تو پیتے ہیں نا؟"

صابر: تم دودھ پینے کو کہتی ہو، اس نے دو دن سے آنکھیں تک تو کھولیں نہیں۔

عباسی: یا میرے اللہ! ارے او قلی! بیٹا آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی کچھ نہیں سوجھتی۔

ہاں بیٹا! جلدی کر۔ میاں دیکھیے کوئی یکا ہو تو ٹھیک کر لیجیے۔

یکا روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکے بان سے کہتی تھی۔ "بیٹا! جلدی کر، میں تجھے کچھ زیادہ دوں گی۔" راستے میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے

غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ جب صابر حسین کا گھر قریب آیا تو عباسی کا سینہ زور زور سے اُچھلنے لگا، بار بار دل سے دعا نکلنے لگی، خدا کرے سب خیر وعافیت ہو۔

یکا صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتہً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منھ کو آگیا۔ سر تیورا گیا۔

آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم بچّہ بھوکا پیاسا شام کو گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی۔ شاکرہ، نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا، نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منھ کی طرف چشم پُر نم سے دیکھ کر کہا: "بیٹا نصیر آنکھیں کھولیں۔" نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے تک دایہ کو خاموشی سے دیکھتا رہا اور بولا۔ "انّا آئی، انّا آئی۔"

نصیر کا مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا، نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا، صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولے۔ "تمھاری انّا کو مار کر بھگا دیں گے۔"

نصیر نے منھ بنا کر کہا: "نہیں۔ روئے گی۔"

عباسی بولی: "کیوں بیٹا! مجھے تو تُو نے کعبے شریف بھی نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا۔" صابر حسین نے مسکرا کر کہا: "تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔"

اشارے

۱۔ حجِ اکبر کے معنی ہیں "بڑا حج"۔ جس سال حج کا دن جمعے کو پڑتا ہے، اس سال کا حج "حجِ اکبر" کہلاتا ہے۔ اس کا ثواب بہت بڑا ہے۔

ایک بڑے صوفی اور بزرگ کا قول ہے: "دل بہ دست آور کہ حجِ اکبر است"۔ یعنی دل کو خوش کرو کہ اس سے حجِ اکبر کا ثواب ملتا ہے۔ پھر آگے اُس کی دلیل دی ہے کہ کعبے کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا۔ مگر دل تو اللہ نے بنایا ہے اور

اس میں وہ رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی غم گین یا مصیبت زدہ کی غم خواری کی بڑی اہمیت ہے۔

۲- اس افسانے کے دوسرے حصے کا پہلا پیرا گراف غور سے پڑھیے۔ منشی جی نے عباسی کے خاندان کو گلاب کے پودے سے تشبیہ دے کر اسی لحاظ سے آگے کی عبارت کتنی رنگین اور دل کش بنا دی ہے۔

قواعد

"کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟" یہ سوالیہ جملہ ہے۔ اُردو میں کسی جملے کے شروع میں "کیا" لگانے سے سوالیہ جملہ بن جاتا ہے۔ سوالیہ جملے کو استفہامیہ جملہ بھی کہتے ہیں۔

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- شاکرہ کے اخلاق کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۲- عباسی نے حج کا سفر کیوں چھوڑ دیا؟

۳- عباسی کی نصیر سے محبت کس قسم کی تھی؟

۴- نصیر کی صحت کس علاج سے ہوئی؟

۵- چار استفہامیہ جملے بنائیے۔

۶- ذیل کے جملوں کو سادہ لفظوں میں بیان کیجیے:

(الف) چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ (ب) کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟

(ج) صابر حسین صورتِ غم بنے بچّے کو پُر درد آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

(د) کیا عباسی امرت پلا دے گی؟ (ہ) اس پر آپ اتنا جھلاّ رہی ہیں۔

۷- ان لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

برہم ہوئی، نت نئے، نت نئی، سفلہ مزاج، رونا رویا اور کہرام۔

۸- اس افسانے کو ایک چھوٹی سی کہانی کی صورت میں لکھیے۔

رُباعیات

(رُباعی، نظم کی ایک قسم ہے۔اس کے معنی ہیں چار مصرعے والی نظم، جس کے چاروں مصرعے بحر ہزج میں ہوتے ہیں۔ پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ ذیل میں چند نامی گرامی شاعروں کی رُباعیات درج کی گئی ہیں۔)

۱- عبرت

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جُز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ! کون ہوگا انیسؔ
ہم ہوں گے اور قبر کا کونا ہوگا

(انیسؔ)

۲- نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد اے فرزند!
اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نَقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

(حالیؔ)

۳- کامیابی کا گر

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اِک کہانی سمجھو

پر، جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو
(حالؔی)

۴- مشکلات کا علاج

خاطر مضبوط، دل توانا رکھو
اُمید اچّھی، خیال اچھّا رکھو
ہوجائیں گی مشکلیں تمھاری آساں
اکبر، اللہ پر بھروسا رکھو
(اکبرؔ آلہ آبادی)

۵- ضرورت کی چیزیں

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزّت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں
(اکبرؔ آلہ آبادی)

۶- قومی عزّت

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزّت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو
(اکبرؔ آلہ آبادی)

۷-دنیا غرض کی ہے

بے گانہ یہاں پر اِک یگانہ دیکھا
اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض، غرض کا اپنی
دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

(داغ دہلوی)

۸-احسان کا بدلہ

احسان کے ہے گر صلے کی خواہش تم کو
اس سے تو یہ بہتر ہے کہ احسان نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کردو اسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

(حالی)

۹-عبرت کا سبق

انقلابِ جہاں کو دیکھ لیا
حُبِّ دنیا سے قلب پاک ہوا
کل، کلی کھل کے ہوگئی تھی پھول
پھول کمھلا کے آج خاک ہوا

(اکبر الٰہ آبادی)

۱۰- قومی غیرت

جس بات میں تم شکستِ ملت سمجھو
اُس میں شرکت کو اپنی ذلّت سمجھو
جو بندہ نفس ہو مخالف اس کا
قومی غیرت کی اس میں قلّت سمجھو

(اکبر آلہ آبادی)

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- دنیا کو نقشِ فانی کیوں کہا جاتا ہے؟
۲- شکستِ ملت کن باتوں میں ہے؟
۳- ان رُباعیات میں جو رُباعی آپ کو بہت پسند آئی ہو، اسے لکھیے اور اس کا مطلب سمجھائیے۔

قواعد

۱- نظم میں "اگر" کی جگہ "گر" لا سکتے ہیں جیسا کہ رباعی نمبر ۸ میں ہے۔
۲- دو لفظوں کے درمیان "زیر" اضافت کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس کے معنی "کا" یا "کی" یا "کے" کے ہوتے ہیں۔ مثلاً: انقلابِ جہاں (یعنی جہاں کا انقلاب یا دنیا کا انقلاب) جس لفظ کے آخر میں "ہ" ہو اس کی اضافت ہمزہ سے دی جاتی ہے۔ اس مثال سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ ایسی اضافت جہاں ہو اس کے معنی بائیں طرف سے کیے جاتے ہیں۔ اب آپ ذیل کے معنی کیجیے:
آغوشِ لحد، حُبِّ دنیا، شکستِ ملت اور بندۂ نفس۔
۳- ان لفظوں کے متضاد الفاظ لکھیے:
توانا، ذلّت، بیگانہ، مخالف اور قلت
۴- اپنی کاپی میں رُباعی نمبر ۱۰ نقل کیجیے اور اس کا مطلب بہ طور مضمون لکھیے اور مثالوں سے بھی سمجھائیے۔

ایک وصیّت کی تعمیل

(مرزا فرحت اللہ بیگ اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز تھے۔ دہلی ان کا وطن تھا مگر عرصہ دراز تک حیدر آباد دکن میں رہے۔ ان کی زبان صاف، شستہ، سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے بہت پُر لطف ہوتے ہیں۔ کسی چیز کا بہ غور مطالعہ کر کے لفظوں میں اس کی ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز سامنے موجود ہے۔ چناں چہ ذیل کے مضمون سے آپ اندازہ کر سکیں گے)

خدا بخشے مولوی وحید الدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھیے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا، پھل نکلے، چمک بڑھی، اہلِ نظر میں قدر ہوئی، اس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔ شہرت بھی غالب کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ اِدھر نام بڑھا اور ادھر مرا۔ صف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا۔ چل چلاؤ کا زور ہے۔ آج یہ گیا، کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحید الدین گئے۔ اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں۔ افسوس ان کو بھی شہرت کی ریہ لگ گئی ہے۔ سوکھتے چلے جارہے ہیں۔ کسی دن یہ بھی خشک ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ تو جو کچھ تھا سو تھا، ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کل کا مرنا بھی عجیب مرنا ہو گیا ہے۔ پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے۔ بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، لو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہو گئی ہے۔ ادھر بٹن دبا، اُدھر اندھیرا گھپ۔ عظمت اللہ خان اِسی طرح مرے۔ مولوی وحید الدین اسی طرح رخصت ہوئے۔ اب دیکھیں کس کی باری ہے۔ اُردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں، وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدّت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں یہاں تھے۔ لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جارہے ہیں۔ کچھ بے ضرورت چلے جارہے ہیں۔ کچھ واقعی

مہمان ہیں۔ کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ عرض یہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پاجامہ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی! یہ کیا ماجرا ہے! کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے؟ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چُور ہو گئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا "میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اِسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا۔" میں پریشان تھا کہ یااللہ! یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے، مر جایئے، مضمون میں لکھ دوں گا۔"

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے پشیمانی ہوئی۔

ادھر ریل چلی، اُدھر ان کی زبان چلی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا "ارے میاں! گدھا ہے، ایک سطر بھی صحیح نہیں لکھتا اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب۔ ہم کو دیکھو تو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے، سر سیّد کی خدمت میں سر گاڑی، پاؤں پہیّا کیا۔ اب جو چند روپلی مل رہے ہیں تو فلاں صاحب ہیں کہ جلے جاتے ہیں۔ خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ مزے کیجیے۔ بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے۔ ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے یہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا پہلے ان کو جا کر

سُناتا۔ بڑے خوش ہوتے۔ تعریفیں کرتے۔ دل بڑھاتے۔ ہائے ان کے گھر کا نقشا اس وقت آنکھوں میں پھِر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا۔ مگر خالی ڈھنڈار۔ ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچّہ، نہ ماما نہ نوکر۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، آواز آئی، "کون ؟" میں نے کہا "فرحت"۔ اسی وقت کُرتا پہنے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہاچٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھے کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں، نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے مولوی صاحب کے گھر بار کا خلاصہ یہ ہے۔

مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسرے پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے۔ چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے کر نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے۔ کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں، کہاں جا کر کھا پی آئے تھے۔ کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب چرنے چگنے تشریف لے گئے۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار دوست، شاگرد، غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے جاتے۔ انھی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انھی کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کرتھے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈے، اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔

میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں

رکھتے تھے اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا مشکل کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچّھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے۔ خُوب سمجھتے تھے اور خُوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے، زبان اُردو کا ایک ستون گر گیا اور ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسروں کی تلاش ہو رہی ہے۔ مگر عثمانیہ یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد لکھ رکھیں کہ چاہے اس سرے سے اس سرے تک ہندوستان بھر میں چھان مارو، مولوی وحید الدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، ان کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت۔

اشارے

۱- مولوی وحید الدین سلیم اصل میں پانی پت کے رہنے والے تھے مگر مدّت تک عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد دکن میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ بڑے ذہین تھے۔ مشرقی زبانوں اور علم لغت کے ماہر اور اصطلاحات کے بنانے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔

۲- جس مضمون میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہوتی ہیں، اسے مزاحیہ مضمون کہتے ہیں۔ کیوں کہ مزاح کے معنی مذاق اور خوش طبعی کے ہیں۔ آپ یہ مضمون پڑھ کر ضرور ہنسے ہوں گے۔ مرزا فرحت اللہ کے مضامین زیادہ تر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد مولوی نذیر احمد کی کہانی لکھی ہے۔ وہ بھی مزاحیہ رنگ میں ہے اور بہت دل چسپ ہے۔ کسی کتب خانے سے لے کر یہ کتاب ضرور پڑھیے۔

۳- مرزا فرحت اللہ کے مزاحیہ مضمون کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مزاح کے ساتھ وہ اصلیت اور حقیقت کو نہیں چھوڑتے۔ جس چیز کا یہ بیان کرتے ہیں، اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ چناں چہ اس مضمون میں مولوی سلیم صاحب کا حلیہ اور ان کے گھر کا نقشہ پڑھیے اور دیکھیے کس انداز اور کتنی سلاست سے کھینچا ہے۔ مبالغے کا ادنیٰ رنگ بھی نہیں جھلکتا۔ اس سے یہ بات اچّھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اچھا انشاء پرداز سادہ بیانی میں بھی اصل واقعے کو دل چسپ بنا سکتا ہے۔

۴- مرزا فرحت اللہ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شوخی اور ان کے مزاج میں سوقیانہ پن نہیں ہوتا۔ یعنی بازاری زبان میں ناشایستہ مذاق نہیں کرتے۔

۵- بتایئے مولوی وحید الدین سلیم نے مرزا فرحت اللہ سے یہ کیوں کہا: "مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے۔"

۶- ان فقروں کی تشریح کیجیے:

(الف) سر سیّد کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پہیّا کیا۔

(ب) آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔

(ج) خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔

(د) یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔

(ہ) یونی ورسٹی کے ارباب حل وعقد لکھ رکھیں۔

۷- اس مضمون میں مرزا فرحت اللہ نے اچّھی اچّھی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ مثلاً شروع ہی میں مولوی سلیم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ایک نگینہ تھے جو برسوں ناتراشیدہ رہا۔ اسی طرح "تیرِ قضا" کہہ کر موت کو تیر سے تشبیہ دی۔

اب آپ اس مضمون میں تشبیہ والے جملے تلاش کر کے لکھیے اور ہر ایک کے ساتھ یہ بتایئے کہ کس چیز کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے۔

۸- ایک جگہ ہے "کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے؟" یہ فقرہ ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی کتاب "مولوی نذیر احمد کی کہانی" میں لکھا ہے۔ آپ یہ کتاب پڑھیے، بہت پُر لطف ہے۔

۹- ان کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

راس آنا، کھینچ بلانا، بڑے بڑے ڈگ بھرنا، دل جلانا، درست ہونا۔

۱۰- مرزا نے اس مضمون کا عنوان "ایک وصیت کی تعمیل" کیوں رکھا ہے؟ آپ اس کے سوا اور کوئی عنوان تجویز کیجیے۔

پاکستان کے لیے پہلا جہاد

مغل بادشاہوں نے قریب قریب تین سو سال جنوبی ایشیا پر حکومت کی۔ آخر میں بادشاہ اور اُمراء عیش میں پڑ گئے۔ ان میں سپاہیانہ اوصاف نہ رہے تو ان کا رعب و وقار جاتا رہا۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز تاجروں نے ان کی کم زوری کو بھانپ لیا اور رفتہ رفتہ ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنے لگے۔ تاہم اُنیسویں صدی کی ابتدا میں پنجاب اور صوبۂ سرحد (خیبر پختون خوا) پر ان کا تسلط نہیں ہوا تھا۔ ان میں سکّھوں کی حکم رانی تھی۔ وہ مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھاتے تھے۔ جابہ جا مسجدوں کی بے حرمتی کرتے اور اذان و نماز سے روکتے تھے۔ ایسے نازک وقت میں ایک مردِ مجاہد کے دل میں اسلامی غیرت کو حرکت ہوئی جس کا مبارک نام سیّد احمد ہے۔

سیّد احمد شہید ہندوستان کے ایک شہر بریلی کے رہنے والے تھے اور دہلی کے مشہور عالم دین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کے شاگرد تھے۔ عالمِ دین ہونے کے علاوہ ان میں سپاہیانہ شان بھی تھی۔ جنوبی ایشیا میں ان کے ہزاروں جاں نثار مرید پھیلے ہوئے تھے۔

جب سیّد صاحب کو سکّھوں کے ظلم و زیادتی کی خبر ہوئی تو وہ فوراً جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور عزم کر لیا کہ سکّھوں کا اقتدار ختم کر کے مسلمانوں کو ذلت کی زندگی سے چھڑائیں گے اور ایک آزاد اسلامی حکومت قایم کریں گے۔

سیّد صاحب نے جب جہاد کا اعلان کیا تو ہزاروں جاں نثار مختلف مقامات سے آ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں نہیں تھیں۔ "سفر نمونہ سقر" تھا۔ ایسے زمانے میں راجپوتانہ، سندھ اور بلوچستان کے راستے صوبہ سرحد (خیبر پختون خوا) تک پہنچنے میں جن سختیوں اور دشواریوں کا سامنا ہوا ہو گا وہ محتاج بیان نہیں۔

سیّد صاحب مجاہدین کی فوج لے کر پشاور کے قریب پہنچے، تب سکّھوں کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اسلام اور مسلمان ابھی زندہ ہیں۔ باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ کئی معرکے ہوئے۔ سب معرکوں میں

سکّھوں کو شکست ہوتی رہی۔ حالاں کہ انگریز بھی ان کے مددگار تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر سیّد صاحب نے اس جہاد میں فتح پائی توان کی بھی خیر نہیں۔ کل انھیں بھی جنوبی ایشیا سے بھاگنا پڑے گا۔

سکّھ جنگ کا ناموافق رنگ دیکھ کر ڈر گئے تو انھیں ایک چال سوجھی۔ اپنے ماتحت حاکم پشاور کو جس کا نام یار محمد خان تھا، سبز باغ دکھایا اور اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ کسی حیلے سے سیّد صاحب کو قتل کرادے۔ اس وقت سیّد صاحب کا فوجی کیمپ نوشہرہ میں تھا اور وہ سکّھوں سے ایک آخری جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔

یار محمد خان نے اپنے چند آدمیوں کو سکھا پڑھا کر نوشہرہ بھیجا۔ انھوں نے سیّد صاحب کی خدمت میں پہنچ کر درخواست کی کہ ان کو جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔

سیّد صاحب نے انھیں اجازت دے دی۔ ان کا ایک آدمی کوشش کر کے کسی طرح لنگر خانے پر مامور ہو گیا۔ جس دن جنگ ہونے والی تھی، اسی دن صبح کے وقت اس غدّار نے سیّد صاحب کے ناشتے میں زہر ملا دیا۔

صبح کے وقت مجاہدین کی فوج میدانِ جنگ کی طرف کوچ کرنے کے لیے کھڑی تھی اور سیّد صاحب کے مقرر کیے ہوئے جنرل حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ دیر ہوئی تو مولانا اسماعیل شہید کو تعجب ہوا۔ یہ سیّد صاحب کے خاص مرید اور بڑے مددگار تھے۔ خیمے میں جا کر دیکھا، تو سیّد صاحب درد سے بے چین ہیں اور فرش پر پڑے ہیں۔ غش پر غش آرہے ہیں۔ دریافت کرنے پر سیّد صاحب نے فرمایا کہ ناشتے کے بعد سے پیٹ میں شدّت کا درد ہے اور نیلے رنگ کی قے ہوئی ہے۔ مولانا سمجھ گئے کہ ناشتے میں زہر دیا گیا ہے۔ فوراً دوا پلائی۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو مولانا نے فرمایا: اب آپ آرام فرمائیے۔ ہم میدانِ جنگ میں جاتے ہیں۔ مگر سیّد صاحب جیتے جی میدانِ جنگ سے غیر حاضری کب گوارا کر سکتے تھے۔ فرمایا: "اگر میں میدانِ جہاد میں نہ رہوں تو بہت ممکن ہے کہ مجاہدین کے حوصلے پست ہو جائیں۔ میں اللہ کی راہ میں اسی کے دین کو غالب کرنے کے لیے نکلا ہوں، اس لیے مجھے جان کی پروا نہیں۔ بہادر صرف ایک بار مرتا ہے۔ میں ضرور تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

مولانا اسماعیل اس عزم پر حیران تھے۔ دل میں کہتے تھے کہ ایسی نازک حالت میں ان کو میدانِ جنگ میں کس طرح لے چلیں۔ آخر مجبور ہو کر سیّد صاحب کو ایک ہاتھی پر بٹھایا، مگر آپ اس قدر کم زور ہو چکے تھے کہ کسی سہارے کے بغیر سیدھے نہیں بیٹھ سکتے تھے اور ضد یہ تھی کہ "میں سیدھا ہی بیٹھوں گا۔" اس لیے آپ کو

ہودے میں بٹھا کر رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ اس طرح آپ اپنے جاں نثار مجاہدوں کے ساتھ سکّھوں کے مقابلے پر روانہ ہوئے۔

دونوں طرف کی فوجیں جب مقابل ہوئیں تو مجاہدین بے جگری سے لڑے۔ سیّد صاحب نڈھال ہو رہے تھے، مگر ان کو بار بار اپنے سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ وہ کوشش کر کے اپنے چہرے پر شکن تک نہ آنے دیتے تھے۔ مجاہدین کے ساتھ یار محمد خان کے غدّار سپاہی بھی تھے۔ جنگ کا نقشا بدل گیا۔ اس پر بھی مجاہدین نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنی اپنی جگہ ڈٹے رہے اور جامِ شہادت نوش کرتے رہے۔ اب بچّے کھچے مجاہد کب تک ایک بڑے لشکر کا مقابلہ کرتے۔ مصلحت کے طور پر پسپا ہوئے۔ یار محمد خان، سیّد صاحب کو گرفتار کر کے سکھوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجاہدین کو اس کے اس ناپاک ارادے کا پتا چل گیا۔ انھوں نے بہت ہوشیاری اور جواں مردی سے سیّد صاحب کو دشمنوں کے ہجوم سے نکال لیا۔

اس جنگ کے بعد سیّد صاحب کو دِلی صدمہ ہوا۔ اس وجہ سے نہیں کہ شکست ہوئی کیوں کہ مردِ مجاہد شکست سے کبھی غم گیں نہیں ہوتا۔ ان کو غم اس بات کا تھا کہ مسلمانوں نے جو ان کے دینی بھائی تھے، ان کے ساتھ غدّاری کی اور اپنی عاقبت خراب کر کے اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

اس جنگ کے بعد سیّد صاحب نے فیصلہ کیا کہ کشمیر میں اپنا صدر مقام بنائیں اور وہاں سے جہاد جاری رکھیں۔ یہ ارادہ کر کے آپ بقیہ مجاہدین کو لے کر بالا کوٹ ضلع ہزارہ پہنچے تو چند غدّاروں نے سکّھوں کو خبر دے دی۔ خبر سنتے ہی ان کی فوج وہاں پہنچ گئی اور مجاہدوں کو گھیر لیا۔ سیّد صاحب کے ساتھ بہت تھوڑی سی فوج تھی، پھر بھی انھوں نے دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا اور ایک ایک مجاہد نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہا دیا۔ بالا کوٹ میں سیّد صاحب، مولانا اسماعیل شہید اور دوسرے شہداء کے مزارات زیارت گاہِ خاص و عام ہیں۔ سب پر اللہ کی رحمت ہو۔

جو لوگ تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں سیّد صاحب کا جہاد رائگاں نہیں گیا۔ ان کی روحانی قوّت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج سکّھوں کی کہیں حکومت نہیں اور اسلام کی آزاد جمہوریت مملکتِ پاکستان کی شکل میں قایم ہے۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے :

۱- اس مضمون کا عنوان ہے "پاکستان کے لیے پہلا جہاد"۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ عنوان کیوں رکھا گیا ہے؟

۲- سیّد صاحب اور یار محمد خان کے کردار کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کیجیے۔

۳- "روحانی قوّت" سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۴- اگر سیّد صاحب کو فتح ہو جاتی تو آپ کے خیال میں اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟

(ب) ان لفظوں اور محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :

سبز باغ دکھانا، بھانپ لینا، رائیگاں، بے جگری، مامور، معمور۔

قواعد

(الف) جو لوگ تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ...... اس نمونے کے کوئی چار مختلف جملے بنائیے، جن میں خطِ کشیدہ الفاظ ضرور ہوں۔

(ب) "سپاہیانہ" کے معنی سپاہی کی طرح۔ یہ "سپاہی" سے صفت بنائی گئی ہے۔ اس کے لیے "انہ" آخر میں بڑھا دیا گیا ہے۔ اسی قاعدے سے آپ فقیر، شاہ، شاعر، امیر، مجاہد سے صفت بنائیے اور جملوں میں استعمال کیجیے۔

طالب علموں کے نام

سر سیّد کا ایک خط

(سر سیّد احمد خان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مخلص رہنما تھے۔ دلّی میں ۱۸۱۷ء پیدا ہوئے اور علی گڑھ میں ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔ ان کے دو کارنامے غیر فانی ہیں۔ ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ کالج قائم کر کے مسلمانوں کی جدید تعلیم کی بنیاد رکھ دی اور دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اردو میں ہر قسم کے مضامین کو آسان اور سادہ زبان میں ادا کرنے کا نمونہ دکھایا، جس پر آج تک عمل کیا جا رہا ہے۔

سر سیّد کو اپنی قوم کے نوجوانوں سے دلی محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوان اپنے وقت کو مفید تعلیم میں صرف کریں۔ عُلوم وفُنون میں خُوب ترقّی کریں تاکہ قوم کا وقار بڑھے۔ ذیل کے مضمون میں انھوں نے بہت اچھّے انداز میں طلبہ سے خطاب کیا ہے۔)

اے عزیزو! تم نے منزلِ ہستی میں قدم رکھا ہے اور میں بہت سے مرحلے طے کر چکا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ عمر کی پہاڑی کی سیر کرتے وقت جو اوزار مجھے قدرت نے عنایت کیے تھے، ان کو میں اپنی نادانی اور گم راہی سے مناسب طور پر استعمال میں نہ لا سکا۔

پہاڑی کی ابتدائی منزل سے اس کی بلند چوٹی تک جا بہ جا چمن لہلہا رہے تھے۔ مرادوں اور آرزوؤں کے گل ہر طرف کھل رہے تھے۔ ہر ایک جگہ خوشی و انبساط کے سامان تھے۔ اذنِ عام تھا کہ مسافر جس طرح چاہے، استعمال کرے۔ کسی طرح کی روک ٹوک نہ تھی۔ ان سے فائدہ اٹھانا محض مسافر کی عقل اور خواہش پر منحصر تھا۔ مگر حیف کہ میں اس منزل سے آنکھیں بند کیے چلا آیا۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ فضا اور یہ بہار اسی طرح چلی جائے گی اور یہ پُر لطف سامان منزل کے آخری حصے تک ختم نہ ہوگا۔ مگر یہ میری غلطی تھی۔ اب کہ عمر کے آخری مقام پر کھڑا ہو کر پچھلی طے کی ہوئی منزل پر نظر ڈالتا ہوں تو سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عمر کا جو نہایت پُر جوش حصّہ تھا وہ گزر گیا۔ آگے کی طرف جو نظر ڈالتا ہوں تو سارے منظر وادی پُر خار معلوم ہوتے ہیں اور ایسی اونچی چڑھائی نظر آتی ہے کہ جس کا کام یابی کے ساتھ طے کرنا ایک موہوم سی اُمید ہے۔ سامنے کے منظر

کی ڈراؤنی صورت اور طے کی ہوئی منزل کی خوب صورتی چھوڑ آنے کے خیالات میرے دماغ کو ایسا پراگندہ کرتے ہیں کہ رہی سہی طاقت بھی زائل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

اے عزیزو! یہ مایوسی مجھے کیوں حاصل ہوئی اور کیوں میں دنیا سے حسبِ مراد بہرہ ور نہ ہوا؟ صرف اس سبب سے کہ میں نے وقت کی قدر نہ جانی۔ ابتدائے عمر میں جب کہ میں کچھ کر سکتا تھا، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بد قسمتی سے کوئی رہ بر یا ہادی ایسا نہ ملا جو مجھے سیدھے راستے پر ڈالتا۔ کوئی مربی یا محسن ایسا نصیب نہ ہوا جو میرے افعال و اعمال کو مناسب سمت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنی ہی مرضی اور اپنی عقل سے کسی کامل رہ بر کے بغیر اپنی کشتی کو کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک خطرناک چٹان پر آ کر بحرِ ہستی پر جو نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے دانش مندی اور قاعدے کی پابندی سے کام لیا اور وقت کو بے بہا سرمایہ سمجھا وہ کیسے خوش و خرم ہیں اور بحرِ ہستی کو عبور کر رہے ہیں۔

سالہا سال سے سورج صبح سے نکل کر اس نیلگوں چھت پر اپنا معمولی دورہ کرتا ہوا مغرب میں جا ڈوبا۔ مگر میں یوں ہی کاہلی سے بیٹھا ہوا اس کے منھ کو تکتا رہا۔ اس کے قاعدے کی پابندی سے ذرا بھی سبق نہ لیا۔ چاند، ہلال اور بدر ہو کر اپنے مقرر وقتوں پر ظاہر ہوتا رہا۔ مگر مجھے اس کے نمونے سے نصیحت حاصل نہ ہوئی۔ کالے کالے مست بادل اپنے وقت پر آئے اور برس کے چلے گئے۔ بجلی نے آب و تاب کے ساتھ میری مندی ہوئی آنکھوں کو کھولنا چاہا۔ مگر صد افسوس کہ میرے خفتہ دل نے بیداری حاصل نہ کی۔ گرج اور کڑک نے میرے کانوں کو کھولنا چاہا۔ مگر میرے کان پر جوں تک نہ چلی۔ ہوا تیز اور تند، ٹھنڈی اور گرم سب قسم کی چلتی رہی مگر مجھے ذرا سی ہوشیاری نہ ہوئی۔ گھڑی ہر وقت میری جیب میں رہی، مجھے اپنی غم ناک آواز سے ہر منٹ اور ہر سیکنڈ وقت کی پرواز سے خبر دیتی رہی۔ مگر میں نہ سمجھا کہ یہ دراصل میری گزرتی ہوئی عمر کے پاؤں کی آہٹ ہے۔ ہزاروں دفعہ جیب سے نکال کر دیکھا کبھی چھے بجے، کبھی دس بجے، کبھی بارہ بجے، مگر حیف میں نہ سمجھا کہ یہ اپنی ہی عمر کے قدم کے نشان ہیں۔ بہت دفعہ ریلوے اسٹیشن پر گیا، ٹرین کو جانے کے لیے تیار دیکھا۔ مسافر گٹھڑی باندھے سوار ہونے کے لیے تیاری کر رہے ہیں اور بہت سے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے خوشیاں منا رہے ہیں۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور گھنٹی نے ٹن ٹن کی، ریل یہ جا وہ جا۔ اب دیکھا تو نہ وہ ٹرین ہے، نہ وہ رونق۔ اسٹیشن پر ایک اداسی کا عالم ہے۔ اس انقلاب سے میرے دل پر ایک خفیہ چوٹ لگی۔ مگر حیف یہ نہ سمجھا کہ یہ ٹرین زندگی کی رفتار

کی خبر دیتی ہے۔ جو لوگ کہ سوار ہوئے ہیں وہ ملک عدم کے مسافر ہیں اور جو آتے ہیں وہ ملک ہستی کے وارد ہیں۔ اب جب کہ سمجھ آئی اور تجربہ ہوا تو وہ زمانہ نہ رہا۔ نہ وہ طاقت رہی۔ اب جب کہ کسی اسکول یا کالج کی عمارت کے پاس سے گزرتا ہوں اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے، کھڑا ہو جاتا ہوں اور آہ سرد بھر کر کہتا ہوں کہ "افسوس! اب میں دوبارہ لڑکا نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہو کہ میں اس تحریر کے ساتھ پھر از سر نو زندگی کا سفر شروع کروں۔ اب کیا ہو سکتا ہے!"

بس، اے طالب علمو! اور اے میرے ملک کے ہوشیار امیدوارو! میں حسرت کے ساتھ تم سے مخاطب ہوتا ہوں کہ میری کھوئی ہوئی عمر تمھارے راستے میں "نوٹس بورڈ" ہو۔ جس پر یہ درج ہو کہ: خبردار! اس طرف خطرہ ہے سنبھل کر چلو۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- اس خط سے سر سیّد کا کیا مقصد ہے؟

۲- انسان کے پیدا ہونے اور مرنے کو سفر سے کیسے مثال دی جا سکتی ہے؟

۳- دنیا میں ہمیں ہوشیار اور خبردار کرنے کے لیے قدرت نے کون کون سے سامان کیے ہیں؟

(ب) ان لفظوں کے معنی لغت میں دیکھیے اور لکھیے:

بہرہ ور، زائل، عبور اور خرّم۔

(ج) وادیِ پُر خار یعنی کانٹوں سے بھری وادی۔ اس طرح ان کے معنی کیجیے:

دلِ پُر درد، باغِ پُر بہار اور رُخِ پُر نُور۔

(د) دوسری سطر کے لفظ پہلی سطر کے لفظ سے بنے ہیں۔ آپ غور کیجیے اور بتائیے کون سا لفظ کس لفظ سے بنا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

۱- ہدایت، تربیت، احسان، خطاب، قصد، وہم

۲- مربی، مخاطب، موہوم، محسن، ہادی، مقصود

مردِ مجاہد

گھوڑے پہ ہے سوار بہت آن بان سے
ظاہر دلاوری ہے عجب اس کی شان سے
ٹوٹا ہوا ہے خود، تو وردی پھٹی ہوئی
ہر شے ہے اس کی گرد میں رن کی اَٹی ہوئی

کندھے پہ تیز انی کا ہے نیزہ ٹکا ہوا
بیٹھا ہے اپنے گھوڑے پہ کیسا ڈٹا ہوا
تلوار تیز پہلو میں ہے اک لٹک رہی
برچھی سی ہے جو چشم عُدو میں کھٹک رہی

ظاہر ہے چال ڈھال سے اور رنگ ڈھنگ سے
وہ آرہا ہے بس ابھی میدانِ جنگ سے
شاید وہ کوئی معرکہ سر کرکے آیا ہے
صف دشمنوں کی زیر و زبر کرکے آیا ہے

ہیں زخم بے شمار، بدن چُور چُور ہے
فرطِ سرُور سے مگر آنکھوں میں نور ہے
خوش ہے کسی پہ آپ یہ چڑھ کر نہیں گیا
حملہ ہوئے بغیر یہ بڑھ کر نہیں گیا

یہ سچ ہے خاک وخون سے کھیلا ہے جوش میں
اور دشمنوں کی خُوب ہی ریلا ہے جوش میں
جم کر بہادری سے یہ کچھ اس طرح لڑا
بے ساختہ پکار اُٹھے دشمن بھی واہ وا

لیکن کسی کا جنگ میں پیچھا نہیں کیا
مانی شکست جس نے اسے دُکھ نہیں دیا

کچھ اس طرح سے جنگ کا نقشا جما دیا
کم عمر اور ضعیف کو زد سے بچا دیا

عورت پہ اس نے ہاتھ اٹھایا نہیں کبھی
بچّوں کو بُھول کر بھی ڈرایا نہیں کبھی

آبادیوں کو اس نے مٹایا نہیں ذرا
با امن شہریوں کو ستایا نہیں ذرا

ظُلم وستم مٹانے کو تلوار اٹھائی تھی
دنیا کے امن کے لیے تیغ آزمائی تھی

یہ آرزو تھی دین کا جھنڈا بلند ہو
دنیا میں اس کی قوم سدا ارجمند ہو

ارمان تھا کہ راہِ خدا میں شہید ہو
حق پر فدا ہو جان تو بس اس کی عید ہو

یہ مال کے لیے تھی نہ تھی جاہ کے لیے
جنگ، اس کی جنگ تھی فقط اللہ کے لیے

آ شیر مرد! تجھ کو گلے سے لگائیں ہم
لا خاک پا کہ آنکھوں کا سُرمہ بنائیں ہم

مولوی شفیع الدین نیّر

اشارے

۱- یہ نظم مولوی شفیع الدین نیر کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کی نظمیں "اسلامی اخلاق" پر ہوتی ہیں۔ زبان پاکیزہ اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ تکلف اور مبالغے سے بچتے ہیں۔ جو بات بیان کرتے

ہیں، اس کا صحیح نقشا پیش کر دیتے ہیں۔

۲- اس نظم میں انھوں نے ایک مجاہد کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کا کردار بتایا ہے، پھر جہاد (اسلامی جنگ) کا مقصد واضح کیا ہے۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- اسلام میں جہاد کا کیا مقصد ہے؟

۲- مجاہد میں کون سی خُوبیاں ہوتی ہیں؟

۳- مجاہد کی آرزو کیا ہوتی ہے؟

۴- شہادت اور شہید کا کیا مطلب ہے؟

(ب) ان الفاظ اور محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

زیر و زبر کرنا، سر کرنا، آن بان، سرور اور فرطِ غم۔

(ج) اس نظم کو سامنے رکھ کر اپنی کاپی میں اس کا مطلب سلسلے وار اس طرح لکھیے کہ وہ باقاعدہ ایک مضمون ہو جائے۔ اس کا کوئی دوسرا عنوان خود تجویز کیجیے۔

قواعد

"نے" ہمیشہ اس جملے میں آتا ہے جس کا فعل متعدی ہوتا ہے اور اس کا زمانہ ماضی ہوتا ہے۔ مثلاً: "لڑکے نے شکست مانی"۔ اس جملے میں مانی فعل متعدی زمانہ ماضی کا ہے۔ اس لیے اس کے فاعل کے ساتھ "نے" ہے اور فعل کو مؤنث اس لیے لایا گیا ہے کہ مفعول مؤنث ہے۔ پس قاعدہ یہ ہے کہ "فعل متعدی ماضی مفعول" کے مطابق ہوتا ہے۔ اب آپ ان غلط جملوں کو صحیح کر کے لکھیے:

۱- مجاہد نے دکھ نہیں دی۔

۲- مجاہد نے تیغ کے جوہر دکھایا۔

۳- عورت نے کھانا پکائی۔

اُردو کی آخری کتاب

یہ مضمون پطرس بخاری کا ہے۔ اصلی نام سید احمد شاہ تھا۔ انگریزی کے فاضل ادیب اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر تھے۔ ترقّی کرتے کرتے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمایندے بن کر امریکا گئے تھے۔ وہیں ۱۹۵۸ء میں باسٹھ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

پطرس اُردو زبان میں "مزاحیہ نگار" کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کا مزاح مرزا فرحت اللہ بیگ کے مزاح سے مختلف ہے۔ ذیل کا مضمون ان کی کتاب "مضامین پطرس" سے لیا گیا ہے۔ پطرس نے یہ مضمون بچوں کی ایک درسی کتاب کے اسباق کے جملوں کے ساتھ ساتھ اپنے مزاحیہ جملوں کا اضافہ کر کے لکھا ہے۔

ماں کی مصیبت

ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچّہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبّت بھری نگاہوں سے اس کے منھ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے:

۱- وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

۲- بڑا کب ہو گا؟

۳- دولھا کب بنے گا اور دُلھن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴- ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵- تو کب کمائے گا؟

۶- آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹایم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچّہ مسکراتا ہے اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے۔ (باپ کے ساتھ دوسرا بچّہ سوتا ہے) جاگ اُٹھتا ہے

تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کچی نیند میں رونے لگتا ہے تو بے چاری مامتا کی ماری آگ جلا کر ایک اور اُبال دیتی ہے۔ صبح جب بچّے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منھ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا ہے۔ واہ وا وا۔

کھانا خُود پک رہا ہے

دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکار رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے، کسی میں آٹا، کسی میں چوہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلالے، جب چاہے پانی ڈال کر بجھالے۔ آٹا گندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے۔ غرض یہ کہ سب کام ہو چکا ہے لیکن پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے تو کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھانا کھا چکتا ہے تو کھانا اُٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے، کبھی چرخا کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو، مہاتما گاندھی کی بدولت ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے۔ کبھی دریا پر، تاکہ کپڑے والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے آئی اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔ جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انھی سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا! دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانا ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پٹڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتّے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کیے۔ اب دھوبن گائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکی دار ہے۔ دیکھیے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آجائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں، پھر واپس نہیں لے جاسکتے۔ میاں دھوبی تمھارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھراتے ہو۔

اشارات

۱- اب سے کوئی چالیس پچاس سال پہلے لاہور کے محکمہ تعلیم کی طرف سے پرائمری کی درسی کتابوں کا ایک سلسلہ چھپا تھا۔اس کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد تھے۔اس سلسلے کی پہلی کتاب کے تین اسباق یہ تھے:

(الف)"ماں کی محبت"(پطرس صاحب نے محبت کی جگہ مصیبت لکھ دیا)

(ب) تیسرا سبق تھا"کھانا پک رہا ہے"(پطرس صاحب نے اس میں خود کا اضافہ کرکے ایک لطیف مذاق کا اشارہ کردیا ہے۔

(ج) تیسرا سبق تھا"دھوبی کپڑے دھو رہا ہے"اس میں فعل"دھو رہا ہے"کی مناسبت سے آج کا اضافہ کردیا۔

اس طرح عبارت سبق کے سلسلے میں موقع بہ موقع اپنے الفاظ اور جملوں کا اضافہ کرکے مزاح کا سامان مہیا کردیا اور اس کے ساتھ ہی طنز و تنقید کے پہلو کی طرف اشارہ بھی کرتے گئے ہیں جسے اچھے زبان داں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً اصل کتاب میں ابتدائی جملے یہ تھے:

"ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔بچّہ انگوٹھا چوس رہا ہے، باپ حقہ پی رہا ہے۔"پطرس صاحب نے دوسرے جملے میں بچّے کی جگہ باپ رکھ دیا۔(اس سے مقصد یہ ہے کہ یہاں تیسرا جملہ ہونا چاہیے تھا)

اب آپ پوری عبارت غور سے پڑھیے۔ مطلب سمجھیے اور جہاں کسی لفظ یا جملے کا اضافہ ہو، اس کے نیچے خط کھینچ دیجیے۔

۲- مرزا فرحت اللہ اور پطرس کی مزاح نگاری کا مقابلہ کیجیے۔

مولانا محمد علی جوہر

(یہ مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہے جو اُردو زبان کے اچھے انشاء پرداز اور مصنف ہیں۔ انھیں مولانا محمد علی جوہر مرحوم سے بہت محبت تھی۔ اس مضمون میں انھوں نے مولانا کی زندگی کا نقشا بڑے ہی دل کش انداز میں کھینچا ہے)

محمد علی جوہر کو دنیا نے اوّل اوّل جانا تو اس حیثیت سے کہ انگریزی خُوب لکھتے ہیں، بولتے ہیں، علی گڑھ کے فدائی ہیں، قوم کے شیدائی ہیں۔ ابھی کالج میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے قایم کی۔ خود ہی صدر بنائے گئے۔ لوٹ کر آئے تو بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمز آف انڈیا، بمبئ (ممبئ) میں مضمون نگاری شرع کی۔ شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آ گیا۔ کلکتے سے اپنا انگریزی ہفتے وار اخبار "کامریڈ" نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دُھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے ہر طرف، ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی۔ شیکسپیئر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خُوب لکھ دی۔ مسلم یونی ورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا۔

۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے "ہم درد" بھی نکالا۔ اب محمد علی جوہر ایڈیٹر نہ تھے۔ ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر۔ صحیح معنی میں لیڈر تھے۔ اب قوم ان کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی جوہر بے خودانہ اور مجنونانہ اُدھر لپکے۔ بلقان میں اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علی جوہر کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشّان اور یادگارِ زمانہ طبّی وفد ہی ترکی روانہ کر دیا۔ چندے کے لیے پکارا تو روپے کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کان پور کا ہنگامہ پیش آیا۔ محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں کود پڑے۔ اب ان کا شمار ہوشیاروں، عاقلوں میں کب تھا؟ اب وہ مستوں کے مست تھے۔ مست الست!

ولایت گئے اور آئے، گرجے، چیخے، چلائے۔ دم نہ لینے پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ شروع ہو گئی۔

خلافت اسلامیہ کی جنگ۔ آہ! وہ آخری جنگ جس میں خلیفہ اسلام کا پرچم آخری بار لہرایا۔ محمد علی جوہر اب اپنے عالم میں کہاں تھے؟ قلم کا ایک ایک لفظ تیر ونشتر، منھ کا ایک ایک بول خنجر، زبان کھولی تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں اکٹھے پانچ برس کی۔ عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے۔ اس میں پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نذر۔ شاعری کے جوہر اسی زمانے میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بن کر نالہ وفریاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورے جاتے ہیں:

اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا، دیکھ　　　ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے

اس نظر بندی کے زمانے میں ایک بار ریل پر ملاقات ہوئی۔ پوچھا، رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا۔ "ارادے کیسے؟ اب دُھن تو صرف ایک ہی ہے۔ یورپ پہنچوں گا اور گلی گلی، گھر گھر، تبلیغِ اسلام کروں گا۔"

نظر بندی اور اس کے بعد جیل۔ پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار۔ توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پینترے۔ ادھر ہندوستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان۔ شروع سنہ ۱۹۲۰ء تھا کہ محمد علی جوہر دو ایک رفیقوں کو ہم راہ لیے دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن و پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں۔ وقت کی ضرورت ناگزیر کہ موضوعِ تقریر صرف تحفظِ خلافت ہی رہے۔ لیکن موقع جہاں کہیں نکل سکا چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی۔

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ عدم تشدد پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی تھا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء میں پکڑے گئے اور جکڑے گئے۔ ۱۹۲۳ء تک کچھ کم دو برس پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ سرکار کے مہمان۔ اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے، لیکن سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی۔ ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سن ہی لیجیے:

معراج کی سی حاصل سجدے میں ہے کیفیت
ایک فاسق وفاجر میں اور ایسی کرامتیں!

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ استقبال میں وہ بھی پیش پیش تھے، جن کے ہاں وطن مذہب سے عزیز تر اور دنیا دین پر مقدم، کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اُٹھا۔ محمد علی جوہر کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا۔ سب نعروں سے بالاتر وہی "نعرۂ تکبیر" وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا نعرہ "اللہ اکبر"۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۱ء تک زندہ ضرور رہے اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ، قسطنطنیہ اور انگورہ[1] بھی آئے گئے۔ آخری سفر دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لیے اور اصل میں سفرِ آخرت۔ بدبینوں نے کہا، اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے ہی کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندو سب پکار اُٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے یا ایک متحرک کوہِ آتش فشاں! فاش اور برملا کہا جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے کہ: "آزادی لینے آیا ہوں۔ یا آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر!"

مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو چوتھی تاریخ اور شعبان ۱۳۵۰ھ کی پندرھویں شب میں عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے۔ مشیتِ الٰہی نے یہ نعمتِ عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی۔ شاید کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس نعمت کے اہل ثابت نہیں ہوئے تھے۔ آزادی محمد علی جوہر کے ملک کو کیا ملتی، محمد علی جوہر کی روح کو البتہ مل گئی۔ بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ عمر کل باون سال کی پائی۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمینِ قدس میں قبلہ اوّل میں، ہیکل سلیمان کے قریب۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر   یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

---

(۱) انقرہ

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- محمد علی جوہر کی علمی قابلیت کے بارے میں بتائیے۔

۲- محمد علی جوہر کی زندگی کن کاموں میں گزری؟

۳- محمد علی جوہر کے اسلامی جذبے کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

(ب) ذیل کی صفتوں سے بڑے درجے کی صفتیں بنا کر جملوں میں استعمال کیجیے:

قریب، عظیم، روشن، تازہ، وسیع

(ج) عمر، سن، کلام، دم، درد سے پہلے ہم لگا کر معنی کیجیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

(د) ذیل کے جملوں کی توضیح کیجیے:

(الف) شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔

(ب) شاعری کے جوہر چمکے

(ج) سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی۔

(د) سرزمینِ قدس میں قبلہ اوّل میں ہیکل سلیمان کے قریب دفن کیے گئے۔

(ہ) اس سبق میں "آتش فشاں" کس موقعے پر اور کیوں کہا گیا ہے؟

قواعد

۱- کسی لفظ سے پہلے "ہم" آتا ہے تو اشتراک کے معنی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ہم وطن یعنی ایک وطن والے۔

۲- تحسین و تعریف اور اظہارِ مسرت کے لیے "واہ وا، سبحان اللہ" بولتے ہیں اور اس کے بعد یہ نشان دیتے ہیں "!" تعجب کے موقعے پر بھی یہی نشان دیا جاتا ہے۔

۳- عزیز، عزیز تر، عزیز ترین۔ یہ تینوں صفت ہیں۔ پہلا لفظ معمولی سی صفت ہے۔ عزیز تر (زیادہ عزیز) اُس سے بڑھ کر اور تیسرا عزیز ترین (سب سے زیادہ عزیز) سب سے بڑھ کر ہے۔ صفت کے درجے کہلاتے ہیں۔

آمدِ بہار

(یہ نظم شوق قدوائی کی ہے۔ ان کا نام احمد علی تھا۔ ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ ان کے کلام میں سادگی ہے۔ محاوروں کو خُوب کھپاتے ہیں۔ دیکھیے اس نظم میں بہار کے آنے کا نقشا کس سادگی و عمدگی سے کھینچا ہے)

ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

ہوائے صبح اس کے ساتھ پنکھا جھلتی آتی ہے
ہنسی پڑتی ہیں کلیاں، جب یہ ان کو منھ لگاتی ہے

پہاڑوں سے بہایا اس نے برفِ صاف پگھلا کر
رواں ہوکر وہی پانی، سمندر میں گرا جاکر

شمیمِ باغ نے سیکھا چلن اِترا کے چلنے کا
زمانہ آگیا پردے سے سبزے کے نکلنے کا

دُلھن کی شکل پر گل نے لباسِ سرخ پہنا ہے
شجر کے جسم پر کیا خُوش نما پھُولوں کا گہنا ہے

تعجب کیا جو ہیبت سے خزاں کے منھ پہ زردی ہے
کہ وہ فوج اس پہ غالب آئی جس کی سبز وردی ہے

پلاتی ہے شجر کو اوس اپنا دودھ لا لا کر
محبت سے ہوا منھ چُومتی ہے بار بار آکر

جڑیں اندر ہی اندر پھیل کر قوّت پکڑتی ہیں
زمیں ان کو جکڑتی ہے، زمیں کو وہ جکڑتی ہیں

چمن اور دشت میں ہے ہر طرف انبار پھولوں کا
جدھر دیکھو زمیں پہنے ہوئے ہے ہار پھولوں کا
ہیں روشن چاندنی کے پھول یا تارے چمکتے ہیں
کھلے ہیں پھول لالے کے کہ انگارے دہکتے ہیں
ہزاروں رنگ کی چڑیاں ہیں شکلیں خُوش نما جن کی
ادائیں دل رُبا جن کی صدائیں نغمہ زا جن کی
بہار آنے سے خوش ہیں ہر طرف اتراتی پھرتی ہیں
ہوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں

(شوقؔ قدوائی)

اشارے

۱۔ اس نظم میں شاعر نے کئی جگہ تشبیہیں دی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی چیز کو کسی چیز سے مثال دینے کو تشبیہ کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر میں چاندنی کے پھول کو تارے سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ تشبیہ سے کلام میں خُوبی پیدا ہو جاتی ہے۔

۳۔ بہار کا موسم جاڑے کے بعد فروری میں شروع ہوتا ہے۔

قواعد

۱۔ تعجب کیا جو ہیبت سے خزاں کے منھ پر زردی ہے
کہ وہ فوج اس پر غالب آئی جس کی سبز وردی ہے

خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے زرد ہو کر جھڑتے ہیں اور موسمِ بہار میں سبز پتے نکل آتے ہیں۔ شاعر اس خیال کو یوں بیان کرتا ہے کہ موسمِ بہار اپنی فوج لے کر خزاں سے جنگ کرنے آیا۔ اس وجہ سے خزاں

ڈر گئی اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ گویا زرد ہونے کا سبب ہیبت ہے۔ حال آں کہ حقیقت میں یہ سبب نہیں ہے۔ کلام میں کسی ایسی بات کا سبب اس طرح بیان کرنا کہ حقیقت میں سبب نہ ہو، خُوبی سمجھی جاتی ہے۔ اس کو "صنعتِ حسنِ تعلیل" کہتے ہیں۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- دوسرے شعر کو پڑھیے۔ مطلب بیان کیجیے اور بتائیے کہ شاعر نے بیان میں کیا خُوبی پیدا کی ہے؟

۲- اس نظم میں مندرجہ ذیل چیزوں کو کن سے تشبیہ دی گئی ہے:

گل، شجر اور لالے کے پُھول

۳- ذیل کے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

خُوش نما، گہنا، انبار اور دل رُبا۔

۴- ان چیزوں کو آپ سوچ کر کن چیزوں سے تشبیہ دیں گے؟

آسمان، کلی، چہرہ، شبنم اور دانت۔

۵- اس نظم کو نثر کی صورت میں لکھیے۔

اُردو کی کہانی

اُردو زبان جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد کم و بیش ۴۵ کروڑ ہے۔ یہ زبان کیوں کر بنی۔ کیسے پھولی پھلی اور کس طرح اس نے موجودہ صورت اختیار کی؟ اس کہانی کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی زبان سے سنیے۔ جنھیں اُردو زبان کا ایک بڑا محسن ہونے کے سبب سے "بابائے اُردو" کہا جاتا ہے۔ ان کا انتقال نوّے سال کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ہوا۔ مرحوم نے اپنی زندگی اُردو کی ترقّی کے لیے وقف کر دی تھی۔

زبان نہ تو کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول سے بیج سے کونپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھوٹتی اور پُھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے، اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پُھولتی پھلتی ہے۔

اُردو اس زمانے کی یادگار ہے جب مسلمان فاتح ہندوستان میں آئے اور اہلِ ہند سے ان کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا۔ اس وقت سے ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہو چلا۔ جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کر لی جس کا کسی کو سان گمان نہ تھا۔ مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانے تک ان کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں اسی کا سکہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسے شوق سے سیکھا۔ اس زمانے میں فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ فضیلت کا ملنا بغیر تحصیل زبان عربی ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے عُلوم وفنون کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ ادھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی، اسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ عوام وہی زبان بولتے تھے۔ چناں چہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے۔ مسلمان شاہی درباریوں اور عُلماء وشعراء نے بھی یہی زبان سیکھی اور اس میں تصنیف وتالیف بھی کی۔

غرض ہندوستانیوں کے اس میل جول اور خلط ملط سے ایک نئی زبان نے جنم لیا جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا ہے۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہے ظاہر ہے۔ یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اس لیے

اوّل اوّل ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے اور اس کے لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمنے لگے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچّے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور پال پوس کر بڑا کیا۔ بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندوستان پر مسلط ہوئی، جو ہندو مسلمان سے بالکل غیر تھی۔ اس قوم نے اس کی انگلی پکڑی۔ اس نے انگلی پکڑتے ان کا پہنچا پکڑا اور دربار سرکار میں اس کی رسائی ہوگئی اور رفتہ رفتہ دفاتر سے فارسی زبان کو نکال باہر کیا اور خود اس کی کرسی پر جلوہ گر ہوگئی۔ آخر ہندوستان کی قدیم راج دھانی اس کا جنم بھوم اور دوآبہ اس کا وطن ہوا۔

اب یہ دور دور پھیل چکی ہے اور ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک چلے جایئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ ہندوستان کے باہر تک جا پہنچی ہے۔ اب سب سے بڑھی چڑھی بات یہ ہے کہ یہ تین مختلف جلیل القدر قوموں کی یعنی ہندو، مسلمان اور انگریز کی چہیتی ہے اور ان تینوں کی متفقہ کوششوں کی عظیم الشان یادگار ہے۔ تینوں نے اسے سیکھا، پڑھا، لکھا۔ تینوں نے اس کی ترقّی میں مقدور بھر کوشش کی اور اب تینوں کی بدولت اس رتبے کو پہنچی ہے کہ دنیا کی جدید زبانوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہوگئی۔

اُردو، ہندی نثر اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شایستہ صورت ہے۔ ہندی بولی فارسی کے میل سے بنی ہے۔ اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں وہ زمانہ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدّا پن اور کرختگی اور تلفظ وہجے کی دقّت تھی بالکل جاتی رہی۔ اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف سیدھے سادے رہ گئے۔ جس سے زبان میں لوچ، گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی۔ اُردو کے ہندی نژاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیوں کہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء وصفات میں پیدا ہوا ہے ورنہ زبان کی بنیاد یہیں کی زبان پر ہے۔ تمام حروف فاعلی، مفعولی، اضافہ، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔ افعال سب ہندی ہیں۔ لیکن فارسی عربی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خُوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا اثر خاص ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ میں شان وشوکت۔ زبان کے لیے دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہے۔

عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات میں بھی وسعت پیدا کر دی ہے جس سے اس کا حسن

دو بالا ہو گیا ہے۔ اور وہ زیادہ وسیع اور کار آمد بن گئی ہے۔ مگر اصل بنیاد جس پر وہ قایم ہے، ہندی ہی ہے۔ بعض غیر زبانوں کے اسماء وصفات کے اضافے سے اس کے ہندی ہونے میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً آج کل بہت سے انگریزی لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں لیکن اس سے زبان کی اصلیت وماہیت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ زبان مختلف حیثیتوں سے ایسی قبول صورت ہوگئی ہے کہ اس کی ترقّی میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی صفائی، فصاحت اور صلاحیت اور رہندی، فارسی، عربی اور انگریزی کے مفید اثرات اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ دنیا کی ہونہار زبانوں میں سے ہے اور ایشیا میں ایک روز اس کا بھی ستارہ چمکے گا۔

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- اُردو زبان کی ابتدا کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی؟

۲- شروع شروع میں بڑے درجے کے لوگ اس زبان میں باتیں کیوں نہیں کرتے تھے؟

۳- مولوی عبدالحق نے فرمایا ہے "اُردو کا ستارہ ایک روز ایشیا میں چمکے گا۔" اس کا کیا مطلب ہے؟ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قواعد

۱- عُلوم (علم کی جمع ہے) اخبار (خبر کی جمع ہے) دفاتر (دفتر کی جمع ہے) صفات (صفت کی جمع ہے) شعراء (شاعر کی جمع ہے)۔ انھی وزنوں کا خیال کر کے ذیل کے اسموں کی جمع بنائیے:

فن، صاحب، قوم، قدم، صنعت، ثقہ، اصل، عالم اور حکیم۔

۲- ان جملوں کی تشریح کیجیے:

(الف) ہندوستان کی قدیم راج دھانی اس کا جنم بُھوم اور دوآبہ اس کا وطن ہو گیا۔

(ب) اردو تین مختلف جلیل القدر قوموں کی چہیتی ہے۔

(ج) بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء وصفات میں پیدا ہوا ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا ایثار

حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ

اِک دن رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال، راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سن کے فرطِ طرَب سے عمرؓ اُٹھے
اُس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدّیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہ وار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس
اِیثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پُوچھا حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اے عمرؓ!
اے وُہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
مسلم ہے اپنے خویش واقارب کا حق گزار
کی عرض "نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار"
اتنے میں وہ "رفیقِ نبوتؓ" بھی آگیا
جس سے بنائے عشق محبت ہے اُستوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرِشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

بولے حضور ﷺ، چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وُہ عشق و محبت کا رازدار
پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پُھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

علامہ اقبالؔ

اشارے

۱- اپنی ضروریات سے بے پروا ہو کر دوسرے کی ضرورت پوری کرنا یا خود تکلیف اُٹھا کر دوسرے کو آرام پہنچانا ایثار ہے۔

۲- علامہ اقبال نے اس نظم میں ایثار کی ایک اعلیٰ مثال اسلامی تاریخ سے لے کر بیان کی ہے جو بہت ہی مؤثر ہے اور سچے مسلمان کے کردار کا نمونہ ہے۔ یہ نظم اُن کے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں شامل ہے۔

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- "راہِ حق" کے معنی ہیں: "حق کا راستہ"۔ یہ فارسی ترکیب ہے۔ یہاں راہ کے نیچے جو زیر دیا گیا ہے اس کے معنی "کا" یا "کی" یا "کے" ہیں۔ اسی طرح "سرورِ عالم حضرت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ" کے معنی کیے جائیں گے، "عالم کا سردار"۔

۲- ذیل کے الفاظ کے معنی دریافت کیجیے یا لغت میں تلاش کیجیے:
طرب، راہوار، ملتِ بیضا، مردِ وفا، سرشت اور چشمِ جہاں۔

۳- ایک شعر میں "رفیقِ نبوّت" کسے کہا گیا ہے؟ اور کیوں؟ معلوم نہ ہو تو استاد سے دریافت کیجیے۔

۴- اس تاریخی واقعے کو بہ طور مضمون اپنی کاپی میں لکھیے۔

اسلامی کردار

بعض حیوانات اپنی نوع کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ چیونٹا جب کہیں خوراک کا ذخیرہ پاتا ہے تو وہ دوڑتا ہوا اپنی جماعت میں جاتا ہے اور سب کو خبر کر دیتا ہے۔ تنہا نہیں کھاتا۔

شہد کی مکھیوں کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ شہد کا چھتا ان کا وطن ہے۔ اس میں وہ ایک قوم بن کر رہتی ہیں۔ اپنے وطن کو محنت سے بناتی اور سنوارتی ہیں۔ بڑی تن دہی سے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ بہت سلیقے سے اپنے ذمے کے کام کو انجام دیتی ہیں اور جب کوئی ان کے وطن پر دست درازی کرتا ہے تو سب مل کر پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔

ایک حقیر کیڑے میں اپنی قوم اور اپنے وطن کے ساتھ وفاداری کا جذبہ ہو اور کوئی انسانی جماعت اس سے خالی ہو، تو اسے اشرف المخلوقات کیسے شمار کیا جائے گا۔

پاکستان ہمارا وطن ہے۔ یہ پورا ملک ہمارا گھر ہے۔ اس گھر کے سارے باشندے ایک ہی گھر کے افراد ہیں۔ سب کے ذمے الگ الگ کام ہیں۔ کوئی گھر کی حفاظت پر مامور ہے، کوئی گھر بنانے سنوارنے کا ذمے دار ہے۔ کوئی گھر والوں کے لیے غذا اور خوراک مہیا کرتا ہے۔ کوئی لباس اور ضروریات پوری کرتا ہے۔ کوئی صنعتی پیداوار کی تیاری میں مصروف ہے۔ کوئی ملک کی دولت بڑھانے کے لیے غیر ملکوں سے تجارت کرتا ہے اور کوئی تعلیم کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کو اپنی قومی روایات کے مطابق علم و تہذیب سے آراستہ کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

جس طرح قدرت نے ہمارے جسمانی نظام کو قایم رکھنے کے لیے سب اعضاء کے ذمے مختلف کام مقرر کر دیے ہیں۔ ہاتھ پاؤں محنت کرتے ہیں اور روزی کماتے ہیں۔ ہم ہاتھ سے لقمہ بنا کر منھ میں ڈالتے ہیں۔ دانت کی چکی اسے پیستی ہے۔ غذا منھ کی راہ سے اُتر کر معدے اور کئی مقامات میں جا جا کر ہضم ہوتی ہے اور مختلف شکلیں بدل بدل کر آخر میں خُون بن جاتی ہے۔ خُون جسم کے تمام اندرونی اور بیرونی اعضاء کو ان کے حصے رسد کے مطابق پہنچتا رہتا ہے۔ تب کہیں بدن کی صحت و توانائی برقرار رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور بعض اعضاء اپنے حصے سے محروم رہیں تو ان میں قوّت و طاقت نہ رہے اور وہ اپنے کام انجام نہ دے سکیں۔

یہی حال قوم کے افراد کا سمجھ لو۔ پوری قوم ایک جسم ہے اور قوم کے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ قوم کی صحت وطاقت کا دارومدار افراد کی صحت وطاقت پر ہے۔ جن قوموں نے قدرت کے اس راز کو سمجھ لیا ہے، ان کے نزدیک قوم کا ہر شخص خواہ وہ کسی مقام پر ہو، کسی گھر میں ہو اور کسی پیشے کا ہو، اتنا ہی عزیز اور اتنا ہی کار آمد ہے جتنا بدن کا کوئی عضو۔

جب قوم کے تمام افراد میں اس طرح کا تعلق ہوتا ہے تو اسے قومی اتحاد کہا جاتا ہے۔ اس سے قوم زندہ اور طاقت ور ہوتی ہے۔ اس کا رعب غیر قوموں پر ہوتا ہے۔ اس کی زندگی عزت کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ ہر طرح کی آفت کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس قوم کا ہر شخص اپنا قومی کردار ادا کرتا ہے۔

قوم کیا ہے؟ افراد یا اشخاص کا مجموعہ ہے۔ مگر ایسے افراد کا جن کے عقائد یکساں ہوں، جن کی زندگی کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوں، جن پر وہ چلتے ہوں اور کسی خاص تہذیب میں رنگے ہوئے ہوں۔ ایسے افراد کی مجموعی طاقت قومی طاقت ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ قومی طاقت شخصی طاقت کا مجموعہ ہے۔ پس اسی طرح قومی عزّت شخصی عزّت کا مجموعہ ہے۔ جو قوم اپنے قومی فرض کا احساس رکھتی ہے، اس کی نظر میں قوم کا ہر فرد عزیز ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں کی شان دار تاریخ میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چناں چہ سلطنت عباسیہ کے زمانے میں خلیفہ معتصم باللہ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ عموریہ کی عیسائی ریاست میں کسی عیسائی نے ایک مسلمان عورت کو تھپڑ مار دیا۔ بے چاری غریب رو کر کہنے لگی کہ "آج اسلامی حکومت میں ہوتی تو ذلت کاہے کو ہوتی۔"

خلیفہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ دربار کے نجومی نے کہا "آج کا دن منحوس ہے۔ فوج کشی مناسب نہیں۔ جنگ میں شکست ہوگی۔"

خلیفہ نے کہا، "انجام جو کچھ ہو، مجھے اس کی پروا نہیں۔ ایک مسلمان عورت پر ظلم ہوا ہے۔ اس نے فریاد کی ہے۔ خبر پا کر اس کی فریاد رسی نہ کروں تو کل قیامت کے دن خدا کو کیا جواب دوں گا؟ جب وہ پوچھے گا کہ ایک مسلمان عورت پر ظلم ہونے کی خبر تُو نے سنی تھی اس کی مدد کرنے میں کیوں تاخیر کی؟"

قصّہ مختصر، خلیفہ نے ایک لاکھ فوج سے عموریہ پر چڑھائی کی۔ فتح کے بعد اس عورت کو تلاش کرایا۔ وہ

سامنے آئی۔ تب اطمینان سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد درباری شاعر نے عربی قصیدہ سنایا، جس میں اس جنگ کی تفصیل ہے۔ اس قصیدے کے پہلے شعر میں شاعر نے دربار کے نجومی پر طنز کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"تلوار نجومی سے زیادہ سچ بولتی ہے"

اس کے برخلاف تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جب کسی قوم کے افراد خود غرض اور حریص ہو گئے ہیں، الگ الگ ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں تو آخر کار ذلیل و خوار ہو گئے ہیں اور ان پر طرح طرح کی آفتیں ٹوٹ پڑی ہیں۔ مسلمانوں ہی کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اسپین اور افریقہ کے مغربی ساحل سے چین کے مشرقی ساحل تک ان کا پرچم لہراتا تھا۔ اس کا سبب کیا تھا؟ بس یہی کہ ان میں قومی اتحاد تھا۔ ان کا ایک قومی کردار تھا۔ مگر جب اُن پر شیطان کا جادو ہوا تو ان کے افراد نے الگ الگ راہیں نکال لیں۔ جدائی کے نئے نئے ڈھنگ پیدا کر لیے۔ پہلے نسل اور خاندان کے لحاظ سے تفریق پیدا کی۔ اس کے بعد ملک اور صوبے کے اعتبار سے۔ مثلاً ایرانی، افغانی، مصری، ترکی وغیرہ وغیرہ۔ پھر اتنے ہی کو کافی نہیں سمجھا۔ ایک ملک کے اندر بھی قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ پاکستان ہی کو لو۔ اس میں سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچ کی تفریقیں ایجاد کر لی گئیں۔ حالاں کہ یہ الفاظ صرف مقامی شناخت کے لیے تھے۔

مسلم قوم کے قومی کردار کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اس کے ہر فرد کا ایمان، ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب پر ہے اور اسی کے حکم کے مطابق وہ پوری انسانی برادری کو امن و سلامتی کا پیغام اور عدل و مساوات کا سبق دیتا ہے اور اچھی تدبیر سے برائیوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

مشق

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- شہد کی مکھیوں کو ایک قوم کیوں کہا گیا ہے؟

۲- شہد کی مکھیوں سے ہمیں کن باتوں کا سبق ملتا ہے؟

۳- پاکستان کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے؟ یہ تشبیہ کہاں تک موزوں ہے؟

۴- قوم کسے کہتے ہیں؟

۵- "قومی غیرت" کی کوئی تاریخی مثال پیش کیجیے۔

۶- مسلم قوم میں تفرقے کن راستوں سے آئے ہیں؟

قواعد

۱- ذیل کے جملوں کی خالی جگہوں میں "نے" یا "کو" لکھیے:

(الف) قدرت __________ ہمارے جسمانی نظام __________ قایم رکھنے کے لیے کام مقرر کیے ہیں۔

(ب) اعضاء __________ غذا پہنچتی ہے۔

(ج) ہر شخص __________ اپنی قوم کی حالت کا احساس ہونا چاہیے۔

۲- ذیل کے اسموں کی جمع یا واحد بنائیے:

افراد، رابطہ، قواعد، ضوابط، عقائد، تعلق، احساس، مقام اور تعلیم۔

۳- ان غلط جملوں کو صحیح کیجیے:

(الف) میں نے لاہور جانا ہے۔

(ب) نااتفاقی سے قومیں ذلیل ہوگئی ہیں۔

(ج) خلیفہ نے عورت کو تلاش کرائی۔

۴- "افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر"

یہ علامہ اقبال کے ایک شعر کا مصرع ہے۔ اسے عنوان بنا کر مضمون لکھیے۔

میر معصوم شاہ بکھری

یہ مضمون عبدالواحد سندھی مرحوم و مغفور کا ہے جو اردو اور سندھی زبان کے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ برصغیر کی مشہور قومی یونی ورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاد تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے واپس کراچی آ گئے تھے۔ یہاں وہ حکومتِ پاکستان کے مشہور سندھی رسالے "نئیں زندگی" کے تاحیات مدیر رہے۔ جامعہ تعلیم ملی ملیر کے بچّوں کے رسالے کے اعزازی مدیر تھے۔ بچوں کے لیے عمدہ عمدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں انتقال ہوا۔ ساری عمر بچوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی۔

سید میر معصوم شاہ بکھری کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ مرزا شاہ بیگ ارغون کے والد امیر ذوالنون جب قندھار کے حاکم تھے، اس وقت اس خانوادہ سادات کے جداعلیٰ سید محمد شیر علی وہاں درویشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ قندھار اور اس کے گرد و نواح میں ان کے ہزاروں مرید تھے۔ ان کے چاروں طرف رات دن لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔

شاہ بیگ ارغون نے جب سندھ پر حملہ کر کے اس علاقے کو سموں کے خاندان سے چھینا تو یہ خانوادہ قندھار سے سندھ آ کر بکھر کے مقام پر آباد ہو گیا۔ بکھر اس زمانے میں پورے عروج پر تھا۔ اس کا حکم ران محمود اصفہانی قندھار کے فرماں روا کا دوست تھا۔ اس لیے وہاں سے آنے والوں کو نئی سرزمین پر کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ انھی لوگوں میں سیّد میر معصوم شاہ کے والد سیّد صفائی بھی شامل تھے جو سیّد محمد شیر علی قلندر کی اولاد میں سے تھے۔ سیّد صفائی خود بھی صاحبِ شریعت و طریقت تھے۔ سلطان محمد حاکم بکھر نے انھیں اپنے علاقے کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا۔ یہ ۹۷۷ھ کا واقعہ ہے۔ ۹۹۱ھ میں انھوں نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ۹۸۰ھ میں سلطان اصفہانی نے سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنی بیٹی کی شادی شہنشاہ اکبر سے کر دی تھی۔ دو سال کے بعد سلطان کا انتقال ہو گیا، تو بکھر مغلوں کی مرکزی حکومت کے تحت آ گیا۔ سندھ کے باقی علاقے پر بھی ان کا عمل دخل ہو چلا تھا۔ اب بکھر کے گورنر مغل دربار کی طرف سے مقرر ہونے لگے۔

سیّد میر معصوم شاہ نے زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے اپنے مربی کے داماد یعنی شہنشاہ اکبر کے دربار تک رسائی حاصل کی اور اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر بلند مرتبہ پایا۔ وہاں عبدالرحیم خان خانان سے ان کے تعلقات بڑھ گئے۔ حتٰی کہ گجرات کے معرکوں میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ جب گجرات پوری طرح فتح ہو گیا تو حکم حاکم کے ماتحت احمد آباد میں مقیم ہو گئے، جہاں ان کو نظام الدین بروی جیسے علم دوست انسان کی صحبت نصیب ہوئی۔ یہ بزرگ اس کتب خانے سے متعلق تھے جو خان خاناں نے احمد آباد میں قایم کیا تھا اور جس میں ۹۵ اہلِ قلم کتابوں کی ترتیب و تالیف کے لیے ملازم تھے۔ نظام الدین بروی نے اپنی مشہور تاریخی کتاب "طبقات اکبری" اسی کتب خانے میں بیٹھ کر لکھی۔ اس تصنیف میں میر معصوم شاہ مددگار رہے تھے۔

۹۹۹ھ میں جب اکبر بادشاہ نے خان خاناں کی سرکردگی میں ٹھٹھہ کے حکمران مرزا جانی بیگ ترخان کے خلاف فوج بھیجی تو میر معصوم شاہ بھی فوج میں شامل تھے۔ نصیر پور کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں مغل فوج کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد خان خاناں نے اپنی فوجیں چار حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ علاقوں میں بھیجیں۔ شاہ صاحب کے ہاتھ میں اس فوج کی کمان دے دی جو سیوہن کی طرف گئی تھی۔ مرزا جانی بیگ ٹھٹھہ سے بھاگ کر اس وقت سیوہن میں مقیم تھا، اس نے مقابلے کی تیاری شروع کی لیکن اس کی فوجیں مکلی نامی پہاڑیوں میں مغل فوجوں کے نرغے میں آ گئیں اور شکست کھا کر بھاگ گئیں۔ مرزا جانی بیگ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح تمام سندھ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس ہنگامے میں بہت سے شہر تباہ ہو گئے۔ چناں چہ ٹھٹھہ کو اس کے بعد کبھی پہلی سی شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ میر معصوم شاہ کو ان کی خدمات کے عوض بہت سی جاگیر مل چکی تھی۔ اس لیے وہ اپنے وطن بکھر میں رہنے لگے اور ۱۰۰۰ھ سے ۱۰۰۵ھ تک وہیں مقیم رہے۔ اسی اثناء میں انھوں نے "تاریخ معصومی" لکھی جو سندھ پر بڑی مستند تاریخی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

میر معصوم کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ ۱۰۰۲ھ میں انھوں نے روہڑی کی مشہور عید گاہ بنوائی جو آج تک قایم ہے۔ اگلے سال سکھر میں ایک مینار کی بنیاد رکھی، جس کی تکمیل کا سہرا ان کے بیٹے کے سر رہا۔ لیکن وہ "مینارِ معصومی" کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ ۱۰۰۴ھ میں انھوں نے مینار کی تعمیر کے ساتھ ساتھ سکھر میں ایک مسافر خانہ تعمیر کرایا جو "آرام گاہ" کے نام سے مشہور ہے۔ دو سال بعد سکھر میں ایک بڑی مسجد تعمیر کرائی جو

"مسجد منزل گاہ" کہلاتی ہے۔

اسی دوران جب بادشاہ دکن کے دورے پر روانہ ہوا تو اس نے میر معصوم شاہ کو بھی اپنے ہم راہ لے لیا۔ چوں کہ شاہ صاحب کو تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا، اس لیے وہ ہر نئے مقام پر پہنچ کر ایک قطعہ لکھتے تھے اور اکبر کے دورۂ دکن کی یادگار میں ہر جگہ نصب کرادیتے۔ چناں چہ برہان پور، بیانہ، اُجین اور دھارواڑ وغیرہ میں ایسے کتبے اب تک موجود ہیں۔

اکبر بادشاہ کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا اور وہ ان کی قابلیت کا اتنا معترف تھا کہ جب ایران کے بادشاہ عباس صفوی کے دربار میں سفیر بھیجنے کی ضرورت ہوئی تو نظرِ انتخاب انھی پر پڑی۔ وہ آگرہ سے قندھار کے راستے ایران روانہ ہوئے تو راستے میں بھی یادگار کتبے نصب کراتے رہے۔ چناں چہ تبریز تک ان کے بہت سے کتبے ملتے ہیں۔ تقریباً دو سال وہ سفیر کی حیثیت سے ایران میں رہے۔ اس کے بعد جب آگرہ واپس آئے تو اکبر کا آخری وقت قریب آپہنچا تھا۔

بادشاہ کے انتقال کے بعد میر معصوم شاہ اپنے وطن واپس چلے آئے اور زندگی کے باقی پانچ سال وہیں گزار دیے۔ ۱۰۱۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ سکھر میں "مینارِ معصومی" کے زیرِ سایہ اپنے والد کی قبر کے پاس مدفون ہیں۔

سیّد صاحب مؤرخ اور سیاست دان ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ "نامی" تخلص کرتے تھے۔ چناں چہ ان کے دیوان کے بہت سے نسخے سندھ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان کی مثنوی "راز و نیاز" کے نام سے مشہور ہے جس میں انھوں نے "سسی پنہوں" کی کہانی اپنے خاص انداز میں بیان کی ہے۔

اشارے

۱- اس مضمون سے آپ کو سندھ سے متعلق کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس علاقے کی تاریخی اہمیت کیا ہے اور یہاں کیسے کیسے صاحب علم و فضل گزر چکے ہیں۔

۲- آپ کسی تعطیل میں سکھر اور بکھر جا کر تاریخی یادگاریں ضرور دیکھیے اور ممکن ہو تو ان مقامات کے فوٹو لیجیے اور اپنے مشاہدات نوٹ کیجیے۔

قواعد

"میر معصوم شاہ نے اپنی علمی قابلیت کی بناپر بلند مرتبہ پایا۔"

اس جملے میں "بلند مرتبہ" کی جگہ "عزّت و عظمت" رکھ کر جملے بنائیے۔

پھر دوسرا جملہ "بلند درجات" رکھ کر بنائیے۔

پھر تیسرا جملہ "شہرت" رکھ کر بنائیے۔

مشق

(الف) درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

۱- "سیّد صفائی" کون تھے؟

۲- میر معصوم شاہ نے کہاں تعلیم پائی؟

۳- میر معصوم شاہ کے چار کارنامے بیان کیجیے۔

۴- "خانوادہ" اور "شیخ الاسلام" پر نوٹ لکھیے۔

(ب) مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

عمل دخل، تالیف، تکمیل کا سہرا، ملکہ اور نظر کا انتخاب۔

(ج) اس مضمون کے پڑھنے اور سمجھنے کے بعد میر معصوم شاہ کے بارے میں جو کچھ آپ کو معلوم ہوا ہے، اپنے جملوں میں لکھیے۔